~~١٥٤٣~~

١٠٢٢ ح

العقل والنقل

١٠٢٣ ع

~~١٥٤٥~~

كشف الخطاء عن

معونة السداد

827

سلسلہ

فلسفہ و علم کلام

کا

پہلا نمبر

العقل والنقل

١٣٣٤ھ ١٩١٦ع

جسمیں مستند حوالوں اور محققانہ مباحث کے بعد ثابت کیا گیا ہے کہ عقل سلیم اور
نقل صحیح میں کبھی اختلاف نہیں ہوسکتا۔ اور یہ کہ کبھی عقل کی سلامتی یا نقل کی صحت
میں قصور ہونے کیوجہ سے ایسا پیش آئے تو اسوقت اوس کا فیصلہ کس طرح ہونا چاہیے۔

مؤلفہ

جامع معقول و منقول مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی مدرس دار العلوم دیوبند

باہتمام جناب مولانا حبیب الرحمن صاحب عثمانی دام فیضہ
مطبع قاسمی واقع دیوبند میں چھپی

حق تالیف بذریعہ رجسٹری محفوظ ہے

[illegible]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفےٰ ۔ **مذہب اسلام اور فلسفۂ یونان** میں جب جنگ ہوئی تو مسلمانوں نے علم کلام کے زبردست ہتھیاروں سے اُس کا قطعی فیصلہ کر دیا۔ اور اسلام کو ایسے مضبوط فصیلوں اور دمدموں سے محفوظ کیا جن کے مقابلہ میں اعلیٰ سے اعلیٰ قلعہ شکن توپیں بھی اپنا کوئی اثر نہ دکھلا سکیں۔

یہ کہنا بالکل مبالغہ سے خالی ہی کہ متکلمین نے مذہب کی سطح پر قائم رہ کر حجّت و استدلال کے متعلق جو کچھ اُصول اور قواعد وضع کیے اُن سے تمام باطل توہّمات کی قلعی کھُل گئی۔ فلسفۂ یونان کی ملمع سازیوں کا طلسم ٹوٹا معترضین کی ابلہ فریبیوں کا پردہ فاش ہوا۔ اور قیامت تک کے لیے مخالفین کی نکتہ چینیوں کا سدّباب کر دیا گیا۔ لیکن افسوس کہ ہمارے زمانہ کے بعض کوتاہ نظروں کی تسلّی اس پر بھی نہوئی اور وہ علم کلام کو آج کل کی ضروریات کے حق میں ناکافی ہی سمجھتے رہے۔

ابھی کچھ عرصہ ہوا یورپ سے یہ صدا اُٹھی کہ علوم جدیدہ نے تمام مذاہب کی بنیادوں

میں تزلزل پیدا کر دیا اور مختلف ادیانِ عالم میں سے ایک مذہب بھی اُس کے مقابلہ کی تاب نہیں لا سکا۔

جن لوگوں کو ہر بات کی تصدیق کے لئے یورپ کی وحی کا انتظار رہتا ہی بے چون و چرا اِس پر ایمان لے آئے اور ملک میں اس خیال کو اس قدر شہرت دی کہ اس سرے سے اُس سرے تک جا بجا یہی چرچا ہو گیا۔ علمار نے یہ دیکھکر کہ عام لوگ مذہب سے بد دل ہوئے جاتے ہیں۔ اس کی تحقیق کی طرف توجہ کی مگر تفتیش کے بعد ثابت ہوا کہ اس دعوی میں واقعیت کا بہت ہی کم حصہ شامل ہے۔

اس میں شک نہیں کہ علماء سائنس نے مادیات اور طبیعیات کے متعلق بہت سی جدید باتیں دریافت کیں علم ہیئت (علم الافلاک) میں مفید بیانات کا اضافہ کیا صنعت و دستکاری کے عجیب و غریب کرشمے دکھلائے۔ روشنی اور بجلی وغیرہ کے متعلق جدید تحقیقات سے عالم کو منور کر دیا لیکن اُنھوں نے یہ نہیں بتلایا کہ ان میں سے کون سی بات اسلام کے مخالف ہی یا کس چیز کے ثابت ہونے سے کسی اسلامی مسائلہ پر نقض وارد کیا جا سکتا ہے

فرض کر لو کہ عناصر کی تعداد (۶۷) سے بھی کچھ زیادہ ہے۔ یہ بھی تسلیم کر لو کہ زمین ساکن نہیں متحرک ہے۔ یہ بھی مان لو کہ کواکب سیارہ سات میں منحصر نہیں۔ مگر کیا اس سے توحید کے ثبوت میں کچھ خلل آیا۔ یا نبوت کا دعویٰ باطل ہو گیا۔ کسی آیت قرآنی کی مخالفت ہوئی۔ یا حدیث رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا انکار کیا گیا۔ جب ان میں سے کچھ بھی نہیں تو اب یہ دیکھو کہ علوم جدیدہ نے اسلامی مسائل کے متعلق رداً یا قبولاً کس چیز کی زیادتی کی۔

اس کے جواب میں اُن چند بوسیدہ اور پامال اعتراضات کے سوا کچھ نہیں کہا جاتا جو حدوث مادہ۔ ثبوت معجزات اور حشر و نشر وغیرہ کے متعلق عام طور پر زباں زد ہیں اور

جن کو ہمارے زمانے کے بعض آزاد خیال **مؤلفین** نے اُردو زبان میں ذرا سلجھا کر تحریر کر دیا ہی۔

لیکن جن لوگوں نے **علم کلام** کی تکمیل کو صرف **شرح عقائد** اور **خیالی** کے دائرہ میں محدود نہیں سمجھ رکھا وہ خوب جانتے ہیں کہ علماء اسلام نے کہانتک ان تمام شبہات کا رکیک اور بیجان ہونا ثابت کیا ہے۔ اور کس خوبی اور بسط کے ساتھ ان اعتراضات کا رد لکھا ہی۔ کاش میری اس تحریر کے پڑھنے والے **ابن حزم ظاہری** کی **ملل و نحل**۔ علامہ **علاؤالدین علی طوسی** کی **کتاب الذخیرہ**۔ **فاضل تفتازانی** کی **شرح مقاصد**۔ امام **غزالی** کی **تہافۃ الفلاسفہ** اور اور محققین فن کی نادر تصنیفات کا مطالعہ کریں جس سے اُن کے روبرو میرے اس بیان کی صداقت ظاہر ہو۔

اس بات کا کہدینا اُس کے ثابت کرنے سے زیادہ آسان ہی کہ **علوم جدیدہ** کی روشنی میں تمام **قدیم علوم** ماند پڑ گئے۔ اُس کے مقابلہ میں **متکلمین** کی تحقیقات بالکل بیکار ثابت ہو گئیں اور اُس کے دنیا میں آنے سے مذہب کو موت کا سامنا کرنا پڑا۔

کیا یہ دعویٰ کرنے والے ہمکو خاص اُن مضامین کی ایک فہرست دیکر ممنون بنا سکتے ہیں جن کو **اسلام** اور **متکلمین اسلام** کے دلائل کے مخدوش بنانے میں کسی قسم کا دخل ہو اور جن کی صحۃ و سقم پر قدیم **علم کلام** نے بہت کافی طور پر بحث نہ کی ہو۔

ہماری ایسے لوگوں سے جو حال کے **علماء** کو جدید حملوں کی مدافعت سے عاجز بتلاتے ہیں۔ یہ التجا ہی کہ وہ ضرور ہم کو ایسے مسائل کی مع اُن کے دلائل کے ایک فرد تیار کر کے عنایت فرمائیں جن کا مقابلہ ہمارے بوڑھے اسلام سے نہ ہو سکا۔ اور آخر کار ہمارے سی۔ ایس۔ آئی بہادر کو اُس کے ضعف اور پیرانہ سالی پر رحم کھا کر اُس میں بہت کچھ اصلاح کرنے کی ضرورت پیش آئی تاکہ یہ ترمیم شدہ اسلام نوجوانان یورپ کی نظروں میں وقیع اور باعظمت بن سکے۔

بہرحال۔

اپنی جہالت کیوجہ سے جس کا جو جی چاہے کہے مگر انصاف یہ ہی کہ اسلامی عقائد کے متعلق متکلمین نے جس درجہ موشگافی۔ باریک بینی۔ اور فلسفیانہ نکتہ رسی سے کام لیا ہے اُس نے ہمیشہ کے لئے ہم کو اندرونی اور بیرونی مخالفین اسلام کے پیچیدہ اعتراضات کے حل کرنے سے سبکدوش کر کے اُن کا ممنون احسان بنا دیا۔ اور میں جرأت کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اب بھی دنیا میں امام ابوالحسن اشعری اور ابوالمنصور ماتریدی کے ایسے وکیل موجود ہیں جو اسلامی معتقدات کے متعلق اُن تمام شبہات کا استیصال کرتے ہوئے جو کسی نئے سے نئے پیرایہ میں ظاہر کیے جائیں قدیم علم کلام کے کامل و مکمل ہونیکا ثبوت دے سکیں۔

ہم نے اپنے اُن دوستوں کو جو قدیم علم کلام کو اکثر ناقص بتلایا کرتے ہیں بارہا یہ بھی کہتے سُنا ہی کہ قدیم علم کلام میں صرف عقائد اسلام کے متعلق بحث ہوتی تھی۔ کیونکہ اُس زمانے میں مخالفین نے اسلام پر جو اعتراض کیے تھے عقائد ہی کے متعلق تھے۔ لیکن آج کل تاریخی۔ اخلاقی۔ تمدنی۔ ہر حیثیت سے مذہب کو جانچا جاتا ہی یورپ کے نزدیک کسی مذہب کے عقائد اس قدر قابل اعتراض نہیں جس قدر اُس کے قانونی اور اخلاقی مسائل ہیں۔ اُن کے نزدیک تعدد نکاح۔ طلاق۔ غلامی۔ جہاد کا کسی مذہب میں جائز ہونا اُس مذہب کے باطل ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہی۔ اس بنا پر علم کلام میں اس قسم کے مسائل سے بھی بحث کرنا ضروری ہی اور یہ حصہ بالکل قدیم علم کلام میں موجود نہیں۔

ہمارے ان احباب کا یہ کہنا بالکل سچ ہی کہ قدیم علم کلام کا تعلق صرف عقائد سے ہے۔ قانونی اور اخلاقی مسائل سے اُس میں مطلقاً بحث نہیں کی گئی لیکن متکلمین یہ کرتے تو کیا کرتے علم کلام کا مقصد ہی عقائد تک محدود تھا۔ قانونی اور اخلاقی مباحث کے لئے اُس کی وضع ہی

نہ تھی۔ ان چیزوں کے لئے دوسرے علوم کی حاجت تھی چنانچہ فن تصوف و اخلاق اور علم اسرار الدین نے اس ضرورت کو بھی رفع کیا۔ اور اسلام کی تمام جزئیات۔ نماز۔ روزہ۔ حج زکوۃ۔ نکاح۔ طلاق۔ اور جنگ و جہاد کے مخفی اسرار اور حکمتوں کو نہایت تفصیل کے ساتھ ظاہر کردیا حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ علیہ کی قیمتی تصنیفات اس وقت بھی کثرت سے موجود ہیں جن کے مطالعہ سے میرے اس بیان کی پوری تصدیق ہوسکتی ہی۔ اور اس عنوان کے ذیل میں جس سلسلہ مضامین کے لکھنے کا میں ارادہ کر رہا ہوں اُس میں اس کا خیال رکھونگا کہ حسب موقع ان بیش بہا تصانیف سے مفید اقتباسات حاصل کروں۔

بہرکیف علم کلام جس غرض کی تکمیل کے لئے مدوّن کیا گیا میرے نزدیک اُس نے اُس میں پوری کامیابی حاصل کی۔ اور اب میرا قصد ہی کہ میں اسلامی عقائد کے ہر باب کے متعلق بصورت رسائل عدیدہ یہ دکھلاؤں کہ علماء اسلام نے اُس کو تحقیق کی کس حد تک پہنچا کر چھوڑا ہی۔ اور اب ہم کو اُس میں کہانتک ترمیم یا اصلاح کرنے کی ضرورت ہی لیکن مجھ کو اپنے اصلی مقصد کے شروع کرنے سے پہلے جیسا کہ چند اُن مقدمات کا ذکر کردینا ضروری ہے جن کے بغیر ہمارا مقصد کامل طور پر اور آسانی کے ساتھ دلنشین نہیں ہوسکتا اسی طرح بعض اُن خطرناک غلطیوں پر مطلع کردینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہی جو اُصول کے طور پر عام مسلمانوں میں تسلیم کرلی گئی ہیں اور جو آگے چلکر ہمارے ناظرین کو بعض اصلی مقاصد کے سمجھنے میں مزاحم ہوسکتی ہیں۔

لیکن جس اہم کام اور طویل الذیل سلسلہ کا میں نے بیڑہ اُٹھایا ہی اور جس کا آغاز بنام خدا آج اس رسالہ سے کیا جاتا ہے وہ اُسی وقت انجام کو پہنچ سکتا ہے جب کہ اس مضمون کے

پڑھنے والے کلمات خیر سے میری ہمت بڑھائیں اور خدا کی توفیق شامل حال رہے۔ اور عجب نہیں کہ اگر اس ناچیز مضمون کا کوئی حصّہ پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا تو پھر ہم کو قدیم و جدید ہئیت کے مسائل کے موازنہ کرنے کی بھی اپنے دسترس کے موافق جرأت ہو۔ اور اگر زندگی ہے تو انشاءاللہ ہم علوم جدیدہ کے متعلق اپنی معلومات بڑھانے کی کوشش اور اس مقصد کی تکمیل کی ضرور فکر کریں گے۔

شعر

ور بمیریم عذر ما بپذیر   اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

اس سے قبل کہ توحید۔ رسالت اور جزا و سزا وغیرہ اسلامی اصولوں میں سے ہر ایک اصول کی علٰحدہ علٰحدہ رسائل کے ذریعہ سے بلا شائبہ تعصب مفصل تحقیقات کی جاے اس ایک رسالہ میں چند ایسے امور کا ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے جو اُن مباحث میں امداد دینے کے علاوہ اس موقع پر ایک خاص قسم کی دلچسپی سے خالی نہیں ہیں۔ کیونکہ یہ امور درحقیقت ایسے قوانین ہونگے جن کی صحت اُن محسوسات اور بدیہیات پر مبنی ہوگی جو ہر طرح سے قابل اطمینان ہیں۔ اور انہی سچّے قوانین کی میزان سے ہم آیندہ چلکر اسلامی مسائل کی پوری پوری جانچ کر سکیں گے۔ گویا یہ مقدمات ہمارے نزدیک اُن اصول موضوعہ کے طور پر لکھے جائینگے۔ جن کے سہارے ہمارے اکثر بیانات کی بنیادیں قائم ہونگی۔

اب اگر کسی صاحب کو ان میں سے کوئی اصول مشتبہ یا غلط نظر آئے تو وہ بہت شوق کے ساتھ اپنے اعتراض کو ظاہر فرمائیں۔ لیکن اپنے کسی ایک دعوے کے ثبوت میں بھی چند کہنہ سال یورپین کا نام لینے پر اکتفا نہ کریں۔ تاوقتیکہ اُن کے پاس ایسی ہی کوئی دلیل قطعی نہ ہو جیسا کہ ہم اپنے ہر ایک دعوے کے ساتھ ساتھ پیش کرینگے۔ یا جیسی دلائل قویہ کا وہ ہم سے خود مطالبہ فرمانے کو تیار ہونگے۔ اور اگر وہ صاحب صرف چند جرمنی اور

فرانسیسی مصنفین کے اقوال یاد کر لینے ہی کو علوم جدیدہ میں ماہر ہونا تصور کرتے ہوں تو بحمد اللہ ایسے مباحث سے بھی گو ہم اپنے کو عاجز نہیں پاتے مگر جب ایسے دور از کار فضولیات کا منظر سامنے ہوگا تو ہماری طبیعت بھی صرف اسی قدر جواب کو پسند کرے گی کہ شعر

مدعی گو برو و نکتہ بحافظ مفروش   کلک ما نیز زبانے و بیانے دارد

اس لئے ایسے لوگوں کی خدمت میں ہم عرض کئے دیتے ہیں کہ وہ براہ کرم اپنا اور ہمارا عزیز وقت ہرگز ضائع نہ فرمائیں۔ بلکہ ذرا سی دیر کے لئے سخن پروری۔ ہٹ دھرمی اور نفس پرستی کو فراموش کر کے اور آخرۃ کی عام جوابدہی کو پیش نظر رکھکر ٹھنڈے دل سے اُن قیمتی مطالب کے سُننے میں مصروف ہو جائیں جو بڑی عرق ریزی کے بعد جمع ہو کر بنی نوع انسان کی ہمدردی کی خاطر منظر عام پر لائے جائینگے۔

چونکہ ان مضامین کا سلسلہ اگر خدا کو منظور ہی تو عرصۂ دراز تک قائم رہے گا اس لئے علم دوست احباب سے توقع ہی کہ اس سلسلہ کے تمام رسائل کو ایک جگہ جمع کرتے جائیں تاکہ پہلے میں دوسرے کا یا دوسرے میں پہلے کا کوئی حوالہ آئے تو اس مقام کو بے تکلف نکال کر دیکھ سکیں۔

اب ان تمام ہدایات کے بعد ہم اپنا اصلی مطلب شروع کرتے ہیں اور آرزومند ہیں کہ اسکے پڑھنے والے تمام پُرانے وساوس اور اوہام سے دل کو پاک کر کے اور لا تنظر الی من قال وانظر الی ما قال کو سامنے رکھکر نیک نیتی اور انصاف پرستی کی داد دینے کے لیے آمادہ ہو جائیں وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ اُنیب شعر

شاہا من ار بعرش رسانم سرِ فضل   مملوک این جنابم و مسکین این درم

العقل والنقل

تمام اہل فہم کے نزدیک یہ مسلمات میں سے ہی کہ نقل صحیح یا عقل کامل کا اتباع انسان کے اولیں فرائض میں سے ہی اور انہی دونوں کی اطاعت پر اسکے برگزیدہ کمالات اور حقیقی کامیابیوں کے حاصل ہونے کا انحصار ہی۔ پھر ہر چند کہ اہل تحقیق کے نزدیک ان دونوں حاکموں (عقل و نقل) میں کبھی نزاع اور خصومت بجز اسکے ممکن نہیں کہ یا نقل کی صحت مشکوک ہو یا عقل کی سلامتی میں کچھ نقصان اور فتور واقع ہو جائے۔ مگر جب کبھی کسی وجہ سے کسی موقع پر ان دونوں میں خلاف محسوس ہوتا ہی تو انسان کے خیالات میں سخت تزاحم اور تذبذب پیدا ہو جاتا ہی اور دونوں جانبوں کی کھینچ تان سے اسکو یہ دشواری پیش آتی ہی کہ وہ ان میں سے کس کے حکم کو قبول اور کس کو رد کرے۔ اگر دونوں کی تعمیل کرنا چاہے تو اس کی کیا صورت ہو اور کسی ایک کو ترجیح دے تو کیونکر دے۔

اس لئے سب سے پہلے مگر سب سے مشکل منزل (جسکے طے کیئے بغیر ہم اپنے اصلی مدعا تک نہیں پہنچ سکتے) یہ ہی کہ عقل و نقل کا یہ قدیم جھگڑا چکایا جائے جس کی بدولت پچھلے زمانہ میں سینکڑوں دانشمند آدمیوں کی قربانی ہو چکی ہی اور بہت سے بیقصور لوگ دار پر کھینچ دئے گئے ہیں جب کبھی مدعیان عقل نے قدم جمائے اہل نقل کے استیصال میں تسمہ باقی لگا نہیں رکھا اور جب نقل کے بیوقوف پیرؤوں کا دور دورہ ہوا تو انہوں نے بھی اپنے فریق مقابل کے حق میں سر قلم کرنے یا آگ میں جلا دینے سے کم کوئی سزا تجویز نہیں کی۔

اب دیکھنا یہ ہی کہ اس اختلاف عقل و نقل کی اصلی حقیقت کیا ہی۔ کیا اس خوفناک نزاع میں کوئی صحیح صورت تطبیق کی ممکن ہی۔ کیا کسی اہل مذہب نے ان دونوں میں

تطبیق دینے کی کوشش کی۔ کیا ان تطبیق دینے والوں میں سے کوئی ایک شخص بھی اپنی سعی میں کامیاب ہوا۔

یہ وہ سوالات ہیں جن پر غور کرنا ہر ایک مذہب والے کا فرض ہی۔ اور اسوقت ہم انہی مہتم بالشان امور پر کامل طریقہ سے ایسے آسان پیرایہ میں بحث کرینگے جس میں عام خاص۔ عالم۔ جاہل اور ذکی غبی سب مساوی طور پر حصّہ لیں۔

قدیم سے قدیم روایات پر عبور کرنے سے اسکا ثبوت ملتا ہی کہ عقل و نقل کی یہ نزاع اور باہمی کشمکش کسی ایک قوم، ایک ملک اور ایک ملت کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ انسانی آبادی کے ہر طبقہ اور ہر حصّہ میں دونوں قسم کی طبیعتیں ہمیشہ موجود رہی ہیں۔ جو زمانہ کسی قوم کے حق میں اعلیٰ درجہ کی وحشت۔ بدویت اور عام تاریکی کا فرض کیا جائے اُس میں بھی متمدن اقوام کی مانند دونوں طرح کے خیالات پائے جاتے ہیں۔ بعض لوگ اپنی عقل کے ایسے پابند اور خیالات کے ایسے محکوم ہوتے ہیں کہ جو چیز اُن کی عقل و ادراک سے خارج ہو اُسکو وہ واقع میں موجود ہی نہیں سمجھتے اور ان کے برخلاف بعضوں کی یہ عادت ہوتی ہی کہ جب وہ اپنے کسی نسبی بزرگ یا مذہبی مقتدا سے کوئی بات سُن لیں تو بے چون وچرا اُنکے حکم کے سامنے گردن ڈالدیں بشرطیکہ اُس مقتدا کے مقتدا ہونے پر اُن کو پورا اعتماد حاصل ہو چکا ہو۔

اس کے بعد ان دونوں گروہوں میں طعن و تشنیع کا دروازہ کھل جاتا ہی۔ پہلا گروہ دوسرے کو سادہ دل۔ کم عقل اور بیوقوف سمجھتا ہی اور دوسرا پہلے کو بے ادب۔ مغرور اور نافرمان قرار دیتا ہی۔ رفتہ رفتہ دونوں میں کینہ اور بغض کی آگ بھڑک اُٹھتی ہی اور زبان و دل سے گزر کر ہاتھ پاؤں تک جنگ و جدل کی نوبت پہنچ جاتی ہی۔

یہ سب کچھ ہوتا ہے مگر اس پر بھی امر متنازع فیہ کا تصفیہ نہیں ہوتا۔ بلکہ طرفہ ماجرا یہ ہی کہ بسا اوقات ایک ہی شخص اور ایک ہی کتاب کے دو قول اس مسئلہ میں متناقص پہلو رکھتے ہیں اور ہماری حیرت اور تعجب کی اُس وقت کوئی انتہا نہیں رہتی جب ہم کسی ایک ایسی مذہبی کتاب میں جو کسی فرقہ کے نزدیک خطا و قصور سے بالکل پاک تسلیم کر لی گئی ہی۔ دو متعارض کلام اس بارے میں نظر پڑتے ہیں۔ جب ہم موسیٰ علیہ السلام کی کتاب کی ورق گردانی کرتے ہیں تو امثال سلیمان کے تیسرے باب میں یہ عبارت لکھی ہوئی ملتی ہے کہ:۔

” اپنے سارے دل سے خداوند پر توکل کر، اور اپنی سمجھ پر تکیہ مت کر۔ اپنی ساری راہوں میں اسکا اقرار کر۔ وہ تیری رہنمائی کریگا۔ اپنی نگاہ میں آپ کو دانشمند مت جان۔ خداوند سے ڈر اور بدی سے باز رہ۔ یہ تیری ناف کے لئے صحت اور تیری ہڈیوں کے لئے تراوٹ ہی۔“

اور انہی امثال کے آٹھویں باب میں لکھا ہی کہ:۔

” کیا دانائی نہیں پکارتی اور کیا فہمید آواز بلند نہیں کرتی۔ وہ سڑک کے پاس اونچے مقاموں کی چوٹیوں پر اور چوراہے کے چبوترے پر کھڑی ہوتی ہی۔ وہ پھاٹکوں کے نزدیک شہر کے مدخل پر جہاں سے دروازوں میں داخل ہوتے ہیں چلاّتی ہی کہ اے آدمیو میں تمھیں بلاتی ہوں۔ اور بنی آدم کی طرف اپنی آواز اُٹھاتی ہوں۔ اے بیوقوفو! خرد کو سمجھو اور اے جاہلو! سمجھنے والا دل پیدا کرو۔ سُنو کہ میں لطیف مضمون کہتی ہوں۔ اور میرے لبوں سے جب وہ کھلتے ہیں تو سچّی باتیں نکلتی ہیں کہ میرا مونھ سچ سچ کہتا ہی۔ اور میرے لبوں کو شرارت سے نفرت ہی۔ میرے مونھ کی ساری باتیں صداقت سے ہیں۔ اُن میں کچھ ٹیڑھا ترچھا

نہیں۔ وہ سب اُس کے نزدیک جو دانش رکھتا ہی سیدھے ہیں اور ان کے خیال میں جو حقیقت شناس ہیں راست ہیں۔"

اسی قسم کے متضاد بیانات انجیل مقدس میں بھی پائے جاتے ہیں۔ کسی جگہ اپنی عقل پر خدا کی بندگی کا دارمدار رکھا ہی اور کہیں انسانی عقل۔ انسانی حکمت اور انسانی ادراک کو بالائے طاق رکھنے کی ہدایت کی ہی۔

پاؤل رسول نے جو خط رومیوں کو لکھا ہی اُسکے الفاظ یہ ہیں:۔

"غرض میں اپنی عقل سے خدا کی شریعت اور جسم سے گناہ کی بندگی کرتا ہوں[1]۔"

اس سے صاف ظاہر ہی کہ خدا کی شریعت کا اتباع وہ اپنی عقل کے بھروسہ پر کرتے تھے۔ لیکن اس کے خلاف انہی پاؤل رسول نے جو خط کرنتھیوں کو تحریر کیا ہی اس کی عبارت یہ ہی:۔

"اور میری عبارت اور میرا وعظ انسانی حکمت کے دلفریب بات کے ساتھ نہیں لیکن روح اور قدرت کی دلیل کے ساتھ تھا۔ تاکہ تمہارا ایمان نہ انسانی حکمت سے بلکہ خدا کی قدرت سے ثابت ہووے۔ ہم کاملوں کے نزدیک حکمت کی باتیں بولتے ہیں۔ مگر اس جہان کی اور اس جہان کے فانی حاکموں کی حکمت نہیں بولتے بلکہ ہم وہ حکمت الٰہی بولتے ہیں جو چھپی ہوئی ہی۔ یعنی وہ پوشیدہ حکمت جسے خدا نے زمانے کے آگے ہماری بزرگی کے لیے مقرر کیا[2] تھا۔"

پھر اسی صفحہ پر لکھا ہی کہ:۔

"اب ہم نے نہ دنیا کی روح بلکہ وہ روح جو خدا سے ہی پائی۔ تاکہ ہم اُن رازوں کو جو خدا نے

---

[1] دیکھو انجیل مطبوعہ کلکتہ صفحہ ۴۹۸ +

[2] دیکھو انجیل مطبوعہ کلکتہ صفحہ ۵۲۸ +

> ہمیں بخشتے ہیں سمجھیں اور ہم اُن رازوں کو انسان کی سکھلائی ہوئی باتوں سے نہیں بلکہ روح قدس کی سکھلائی ہوئی باتوں سے غرض روحانی چیزوں کو روحانی عبارت سے ملاکر بیان کرتے ہیں مگر نفسانی آدمی خدا کی روح کی باتوں کو قبول نہیں کرتا کہ اسکے نزدیک نادانی کی باتیں ہیں اور وہ اُن کو سمجھ نہیں سکتا کہ وے روحانی طور سے بوجھی جاتی ہیں۔"

شریعت محمدّی صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی دونوں قسم کے مضامین موجود ہیں۔ ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہی کہ لوگ درجات عقل کے موافق جنت میں داخل ہونگے اور دوسری جگہ اهل الجنة بُلهٌ (یعنی اکثر جنتی لوگ بیوقوف ہونگے) بھی مشہور ہے۔

آپ کے بعد جو علماء اور حکماء آپ کی اُمت میں گزرے اُن کے اقوال بھی اسی طرح بظاہر متعارض رہے۔ اور امام غزالی کے زمانہ تک غالباً بہت کم عالم ادھر متوجہ ہوئے۔ جنھوں نے اس عقل ونقل کے اختلاف پر باضابطہ اور مکمل بحث کی ہو اور تمام شبہات کو رفع کرکے یہ دکھلایا ہو کہ اس اختلاف کا اصلی منشا کیا ہی۔ دونوں فریق کے استدلالات کس درجہ تک درست ہیں اور انبیاء یا اکابر علماء کی کتابوں میں جو بظاہر اختلافات معلوم ہوتے ہیں جن کی طرف ہم نے ابھی اشارہ کیا ہی۔ ان کے اجتماع اور تطبیق کی صحیح صورت کیا ہی۔

میرا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ امام غزالی سے پہلے کوئی شخص عقل ونقل کی تطبیق کی صورت سمجھے ہوئے نہ تھا بلکہ یہ غرض ہی کہ اُن سے پہلے اس مسئلہ کی خاص تشریح کرنے کی کوئی ضرورت پیش نہیں آئی۔ کیونکہ ہر ایک زمانہ کے حکماء اُنھی امور کے بیان میں زیادہ تاکید و تفصیل سے کام لیا کرتے ہیں جن میں کسی قسم کے خفا اور مغالطہ کا اندیشہ ہو۔ یا وہ ایسے امراض ہوں جن کے اندر عام طبائع مبتلا پائی جائیں۔

تم خود اندازہ کرلو کہ والدین کی اطاعت اور اولاد پر ترحم اور شفقت۔ یہ دونوں چیزیں باوجودیکہ مذہبی ضروریات میں سے ہیں۔ مگر اوّل چونکہ ایک گونہ نفس کی خواہش کے خلاف اور دوسرے نہ تنہا انسان بلکہ تمام حیوانات کی اقتضاءات طبعیہ میں سے ہی اس وجہ سے حکیم مطلق نے عقوق والدین کی خرابی اور ان کی اطاعت کی خوبی کو بکرّات و مرّات اور باجمال و تفصیل جسقدر مختلف عنوانوں سے تعلیم فرمایا ہی۔ رحم علی الاولاد کے احکام میں اُس کا عشر عشیر بھی نہیں۔

ٹھیک اسی طرح علماء سلف کے زمانہ میں چونکہ عام طور پر مذہبی روایات کا اعتماد قائم تھا اور زید عمر و بکر کی راے اور خیال سے اُن روایات کا بدل ڈالنا کسی اہل مذہب کے نزدیک بھی روا نہ تھا۔ اسلیے نہ عقل و نقل میں بکثرت نزاعات قائم ہوتے تھے۔ نہ علماء کو ان دونوں کے مقدمات فیصل کرنے کی نوبت آتی تھی۔ اور نہ اس کی حاجت سمجھی جاتی تھی کہ ان دونوں کی تطبیق کے اصول یا اختلاف کے اسباب بیان کیے جائیں۔

اس کے بعد جوں جوں زمانہ گزرا فلسفیت اور الحاد کا رنگ غالب آیا عقول ناقصہ جزئیہ کی گرم بازاری ہوئی اور نقل کی قدر و منزلت گھٹی۔ اسی قدر عقل و نقل کی منازعت بڑہتی گئی۔ اور امام غزالی کے زمانہ تک اس کی ضرورت محسوس ہونے لگی کہ ان دونو (عقل و نقل) کی موافقت و اتحاد کے واسطے کچھ آئین تبلائے جائیں اور ان میں سے ہر ایک کے حدود کی تعین وضاحت کے ساتھ کردی جائے۔ چنانچہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اُس پر قلم اُٹھایا اور انصاف یہ ہی کہ اُنھوں نے اپنے زمانہ کی ضروریات کے موافق اس مقصد کی پوری تکمیل کردی۔

لیکن چونکہ علماء سلف کو اس تعیین و تفصیل کی حاجت پیش نہیں آئی تھی۔ اور علماء ما بعد نے امام صاحب ممدوح کی تشریحات پر حوالہ کردینے کو کافی سمجھا اسواسطے اُن سے پہلے اور

اُن کے بعد اکثر ایسے ہی مبہم اور متعارض اقوال عقل و نقل کے بارے میں جمع ہوتے رہے۔ جس سے آجکل کے کوتاہ نظروں کو سادہ لوح عوام کے گمراہ کرنے کا خوب موقعہ ہاتھ آیا اور اُنھوں نے بزرگوں کے کلام کے وہ مختلف ٹکڑے جنکو امام غزالی نے احیاء العلوم وغیرہ میں عمدہ طور پر جمع کرکے دکھلا دیا تھا۔ جابجا اپنے استشہاد میں پیش کرکے سیدھے اور سچے مسلمانوں کو طریق حق سے ہٹانا چاہا چنانچہ اب میں اس قسم کے اکثر کلام حکماء اور علماء اسلام کی کتابوں سے انتخاب کرکے ذیل میں نقل کرتا ہوں جن کو پڑھکر ایک خالی الذہن آدمی سخت تحیر اور تذبذب میں پڑ جاتا ہی اور اُس کے بعد امام غزالی کی مفصل تقریر ان کی متفرق تصانیف سے اقتباس کرکے ہدیہ ناظرین کروں گا جو اس حیرت اور پریشانی کو کافی حد تک مٹا سکے گی۔

البتہ یہ ضرور ہی کہ عقل و نقل کی جو مخالفت آجکل دیکھنے میں آرہی ہی کہ عرصہ ہوا دونوں حکومتوں میں سُفرا اُٹھ چکے۔ اور اعلان جنگ ہوکر لگاتار معرکہ آرائی ہونے لگی۔ پھر لڑائی بھی باقاعدہ نہیں بلکہ زمانہ حال کی عقل نے غدر پر کمر بستہ ہوکر محض جابرانہ کارروائی شروع کردی۔ چونکہ یہ بہار یا خزاں نہ امام غزالی نے دیکھی تھی اور نہ اُن سے پہلے کسی اور نے۔ اسلئے اگر زمانہ حال کی بعض خصوصیات پر نظر کرکے امام غزالی کی تقریر میں بھی کوئی کمی ہوگی تو میں اسکو آزادانہ ظاہر کرونگا۔ اور پھر کسی اور عالم کی تقریر اگر اُن کی تقریر سے زیادہ تسکین بخش سمجھی جائے گی تو اس کو سب سے اخیر میں درج کرونگا تاکہ ہمارے رسالہ کے وہ ناظرین بھی جن کے دلوں میں اس زمانہ کی اندیشہ ناک آزادی کا کوئی اثر آیا ہو اوّل سے آخر تک تمام آراء کا موازنہ کرکے نیک دلی کے ساتھ سچائی اور راستی کو قبول کرسکیں۔ وللہ در من قال ؎

دورِ عجبے گردش این دائرہ دارد
وقتی است کہ گردوں بگذارد دوراں را

اکنوں اثرِ تربیتِ دہر برآں است   تا صورت خرمہرہ دہد نطفۂ کاں را
برخاستہ زیں شور زمیں چند بخارے   یکسر بکف غول ہوا داد عناں را
سیمرغ خور و قوّت پرواز مگس نیست   بال و پر ایں ہیچمداں ہمہ داں را

سب سے پیشتر ہم اُن حامیان عقل کی طرف رجوع کرتے ہیں جو عام طور پر فلاسفہ اسلام یا حکماء اسلام کے لقب سے مشہور ہیں اور جن کی زندگی کا اکثر حصہ عقل کی پیروی میں صرف ہوا ہی۔ شیخ بو علی سینا اور ابن رشد اندلسی اس گروہ کے بہت بڑے امام گزرے ہیں۔ شیخ نے اشارات کے آخر میں ایک مستقل باب اس کے لئے منعقد کیا ہی کہ انبیاء اور اولیا کے بہت سے علوم ممکن ہی کہ عقول متوسطہ کے مرتبہ سے بالاتر ہوں۔ وہ درحقیقت صحیح ہوں مگر عام طور پر لوگ اُن کو سمجھ نہ سکیں۔ کیونکہ جو چیز انسان میں علوم اور ادراکات کی حاصل کرنے والی ہی وہ ایک لطیف چیز ہی جسکو روح سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور جب علم کے حاصل ہونیکا مبنٰی وہ ہی جزء لطیف ٹھہرا تو جس قدر جسم کی کثافت کو بذریعہ مجاہدات اور ریاضات کے زائل کیا جائیگا اُسی قدر روح کی لطافت میں ترقی ہوگی اور لطافت کے بڑھنے سے علوم میں یقیناً وسعت پیدا ہوتی جائیگی۔ چونکہ انبیاء اور اولیاء بھی ترک لذات اور کسر شہوات کے بعد جسمانی تعلقات سے بہت کچھ بیگانہ ہو جاتے ہیں اسلیے اگر اُن کو بہت سی وہ باتیں معلوم ہوں جو ہم کو نہ ہوں تو یہ کوئی قابل استعجاب امر نہیں ہی۔ اس کے بعد شیخ کہتا ہی۔

والعارفون المتنزھون اذا وضع عنھم وزر مقارنتہ البدن وانفکوا عن الشواغل خلصوا الی عالم القدس والسعادۃ وانتقشوا بالکمال الاعلے وحصلت لھم اللذۃ العلیا وقد عرفتھا

اور خدا کی معرفت رکھنے والے پاک بندے جسوقت ان سے جسمانی تعلق کا بار ہلکا کر دیا جاتا ہی اور دنیوی مشاغل سے وہ علیحدہ ہو جاتے ہیں تو اُن کی توجہ خالص طور پر عالم قدس اور عالم سعادۃ کی طرف مبذول ہو جاتی ہی اور وہ اعلیٰ درجہ کے کمال کے ساتھ موصوف اور بڑی لذت اُٹھانے والے ہوتے ہیں جیسا کہ تم پہلے معلوم کر چکے ہو۔

ولیس ھذا الالتذاذ مفقوداً من کل وجهٍ والنفس فی البدن بل المنغمسون فی تامل الجبروت المعرضون عن الشواغل یصیبون وھم فی ھذه الابدان من ھذه اللذة حظاً وافراً قد یتمکن منھم فیشغلھم عن کل شیٔ[1]۔

اور یہ نہیں کہ جب روح بدن میں ہو تو وہ اس لذۃ سے بالکل محروم رہیں بلکہ ایسے لوگ جو خدا کی عظمت و جبروت کی فکر میں ڈوبے ہوئے اور جسمی مشغلوں سے اعراض کرنے والے ہیں وہ ان اجسام میں رہکر بھی اس لذۃ سے اتنا بڑا حصہ پا لیتے ہیں جو اُن پر غالب آکر تمام اشیاء سے ان کو فارغ کر دیتا ہے۔

شرح اشارات محقق طوسی میں ہے۔

جل جناب الحق تعالیٰ ان یکون شریعة لکل وارد او یطلع علیه الا واحد بعد واحد ولذلک فان ما یشتمل علیه ھذا الفن ضحکة للمغفل وعبرة للمحصل فمن سمعه فاشمأز عنه فلیتھم نفسه لعلھا لا تناسبه و کلٌّ میسّرٌ لما خلق له والمراد ذکر قلة عدد الواصلین الی الحق والاشارة الی ان سبب انکار الجمھور للفن المذکور فی ھذا النمط ھو جھلھم بھا فان الناس اعداء ما جھلوا والی ان ھذا النوع من

خدای تعالیٰ کی جناب اس سے اعلیٰ اور ارفع ہے کہ وہ ہر وارد اور صادر کی گذرگاہ بن جائے یا اُس پر مخصوص افراد کے سوا کوئی مطلع ہو سکے اور اسی وجہ سے صوفیوں کا طریقہ غافل کے نزدیک مضحکہ خیز اور طالب کے واسطے عبرت انگیز طریقہ ہے۔ تو جو اُن کی باتوں کو سُنکر اُن سے اعراض کرے اسکو چاہیے کہ وہ اس بارے میں اپنے نفس کا قصور سمجھے۔ کیونکہ اسکو اُن سے مناسبت نہیں ہے اور ہر شخص کے واسطے وہی بات آسان ہوتی ہے جسکے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ خدا رسیدہ لوگ بہت کم پائے جاتے ہیں اور اکثر لوگ باطنی طریقوں سے اس بنا پر انکار کرتے ہیں کہ وہ اسکو جانتے نہیں۔ آدمی ہمیشہ نامعلوم باتونکا دشمن ہوتا ہے۔

---

[1] منقول از شرح اشارات امام رازی مطبوعہ مصر صفحہ ۴۴۵ ۱۲

الکمال لیس مما یحصل بالاکتساب المحض بل انما یحتاج مع ذلك الی جوھر مناسب له بحسب الفطرۃ[۵۱]۔

یہ کمال ہر ایک کو محض حاصل کرنے سے حاصل نہیں ہوتا تاوقتیکہ اس کا جوہر طبیعت فطرۃ اُس کے مناسب نہ ہو۔

ان دونوں عبارتوں سے شیخ کا اور علامہ طوسی کا یہ مطلب ہے کہ اگر انبیاء اور اولیاء سے بعض ایسے امور منقول ہوں جو ہماری عقل کے دائرہ سے باہر ہیں تو ہم کو ان کی اس بنا پر تصدیق کرنا چاہیے کہ انکے نفوس بہیمیت کی ظلمات اور بشریت کی کدورت سے پاک و صاف ہوتے ہیں اور ہم کو یہ سعادت حاصل نہیں ہوتی۔ لیکن شیخ کی اس تقریر سے اس کا کوئی جواب نہیں نکلا کہ اس صورت میں ہندوستان کے جوگی۔ نصاریٰ کے راہب اور پہلے زمانہ کے اشراقیوں کے تمام علوم کیوں قابل تسلیم نہیں ہیں۔ جبکہ روحانیت کی ترقی کا مدار تجرد اور ترک دنیا پر ہو تو ان لوگوں کا تجرد انبیاء اور اولیا کے تجرد سے کیوں کم ہے۔ بلکہ بظاہر یہ لوگ بہت زیادہ آدمیوں کی مجالست سے متنفر اور انسانی جذبات کے فنا کر دینے والے نظر آتے ہیں۔ چونکہ اس حیثیت سے شیخ کی تقریر بالکل ناقص ہے اسلیئے اب ہم شیخ کو چھوڑ کر دوسرے علماء کے اقوال کا مختصر انتخاب درج ذیل کرتے ہیں۔

قاضی ابن رشد اندلسی جس نے امام غزالی کی کتابوں کا رد لکھا ہے اور جس کو اہل یورپ مسلمانوں کا سب سے بڑا فلسفی خیال کرتے ہیں ایک مقام پر لکھتا ہے کہ خدای برحق نے اپنی سچّی کتاب میں ہم کو جا بجا قیاس اور استدلال کے طریقہ پر توجہ دلائی ہے اور ہر چیز کو عقل سے دریافت کرنے کے لئے آمادہ کیا ہے۔

واذ کانت ھذہ الشرائع حقاً و

اور جب یہ شریعت سچی ہے اور لوگوں کو اس غور و فکر کی طرف

---

[۵۱] شرح اشارات طوسی مطبوعہ مصر صفحہ ۳۹۰ ۱۲

داعية الى النظر المودی الى معرفة الحق فانا معشر المسلمين نعلم على القطع انه لا يؤدی النظر البرهانی الى مخالفة ما ورد به الشرع فان الحق لا يضاد الحق[1]۔

بُلا رہی ہی جس سے خدا کی معرفت حاصل ہو۔ تو ہم مسلمانوں کا قطعی یہ عقیدہ ہونا چاہیئے کہ دلیل اور برہان سے شریعت کے خلاف کبھی ثابت نہیں ہو سکتا (کیونکہ شریعت بھی سچّی ہی اور دلیل بھی سچّی) اور ایک سچّی بات دوسری سچّی بات کے مخالف نہیں ہو سکتی۔

دوسرے موقعہ پر صوفیوں کے روحانی طریقہ کا ذکر کر کے لکھا ہی۔

ونحن نقول ان هذه الطريقة ان سلمنا وجودها فانها ليست عامة للناس بما هم ناس ولو كانت هذه الطريقة هی المقصودة بالناس لبطلت طريقة النظر ولكان وجودها بالناس عبثا والقرآن كله انما دعا الى النظر والاعتبار وتنبيه على طرق النظر[2]۔

ہم کہتے ہیں کہ اس طریقہ کے وجود سے اگرچہ ہم کو انکار نہیں مگر اس میں شک نہیں کہ یہ طریقہ لوگوں میں عام نہیں ہو سکتا۔ پس اگر اسی طریقہ کا رواج پانا شریعت کا مقصود ہوتا تو فکر اور استدلال کا وجود بالکل باطل اور عبث قرار پاتا۔ حالانکہ سارا قرآن قیاس اور استدلال کی طرف بُلا رہا ہی اور نظر کے طریقوں پر متنبہ کر رہا ہے۔

اس کے مقابلہ پر علامہ ابن تیمیہ رسالہ الفرقان میں لکھتے ہیں۔

فمن جرّب ما يقولونه (ای الانبياء) ويقوله غيرهم وجد الصواب معهم والخطأ مع مخالفهم كما قال الرازی مع انه من اعظم الناس طعنا فی الادلة السمعية حتى ابتدع قولا ما عُرف به قائل مشهور غيره وهو انها تفيد لا اليقين

توجو شخص انبیاء علیہم السلام کے ارشادات اور لوگوں کے اقوال کا تجربہ کریگا وہ یقیناً انبیاء کو حق پر اور اُنکے مخالفوں کو خطا پر پائیگا۔ دیکھو رازی جو سب سے زیادہ سمعی روایات کو غیر معتبر ٹھہرانے والے ہیں یہانتک کہ اُنہوں نے ایک ایسی بات کہی جو اُن سے پہلے کسی نے بھی نہیں کہی تھی یعنی یہ کہ روایات سے کبھی یقین کا مرتبہ حاصل نہیں ہو سکتا

---

[1] دیکھو فلسفہ ابن رشد مطبوعہ مصر صفحہ ۶ ۱۲

[2] دیکھو فلسفہ ابن رشد مطبوعہ مصر صفحہ ۳۵ ۱۲

ومع هذا فانه يقول لقد تاملت الطرق الكلامية والمناهج الفلسفية فما رائيتها تشفی عليلا وتروی غليلا ووجدت اقرب الطرق طريقة القرآن اقرأ فی الاثبات اليه يصعد الكلم الطيب الرحمن على العرش استوى اقرأ فی النفی ليس كمثله شئ ولا يحيطون به علما۔ ومن جرب مثل تجربتی عرف مثل معرفتی وايضا فمن اعتبر ما عند الطوائف الذين لا يعتصمون بتعليم الانبياء وارشادهم واخبارهم وجدهم كلهم حائرين ضالين شاكين مرتابين اوجاهلين جهلا مركبا۔ ؎

اُس رازی کو بھی یہ کہنا پڑا کہ میں نے فلسفہ اور علم کلام کے طریقوں میں بہت تامل کیا مگر اُن کو ہرگز ایسا نہ پایا جو ایک مریض کو شفا بخشیں یا کسی پیاسے کو سیراب کر سکیں۔ ہاں تمام راستوں میں نزدیک تر راستہ قرآن کا ہی کہ ثبوت کی جانب میں ہم یہ آیتیں پڑھ لیتے ہیں الیہ یصعد الکلم الطیب الرحمن علی العرش استوٰی اور نفی میں لیس کمثلہ شئ اور لا یحیطون بہ علما۔ اور جو کوئی مجھ جیسا تجربہ کریگا وہ بھی میری طرح اس بات کو سمجھ لیگا۔ اور نیز جو شخص ان لوگوں کے اقوال میں غور کریگا جنھوں نے انبیاء کی تعلیمات اور روایات سے استدلال نہیں کیا تو وہ اُن کو تحیر۔ شک۔ گمرہی اور جہل مرکب میں مبتلا پائیگا۔

شیخ اکبر محی الدین ابن العربی رحمۃ اللہ علیہ نے جن الفاظ سے اپنے ایک خط میں امام فخر الدین رازی کو نصیحت فرمائی ہی وہ اس سے بھی زیادہ صاف اور کھلے ہوئے الفاظ ہیں وہ امام رازی کی حمیت دینے کا شکریہ ادا کر کے تحریر فرماتے ہیں۔ کہ

فاذن ينبغی للعاقل ان يتعرض لنفحات الجود ولا يبقى ماسورا فی قيد نظره وكسبه فانه على شبهة فی ذلك ولقد اخبرنی من الفت به من اخوانك من له فيك نية

اب عقلمند کیلئے مناسب ہے کہ وہ خدا کی جود و کرم کی خوشبوؤں سے فائدہ اُٹھائے اور نظر و استدلال کی قید میں نہ پھنسا رہے کیونکہ وہ اس طرح ہمیشہ مشتبہ حالت میں رہتا ہی چنانچہ مجھ سے تمہارے ایک دوست نے جو مجھ سے ملا اور تمہارے ساتھ

؎ دیکھو رسائل تیمیہ مطبوعہ مصر صفحہ ۱۰۹۔

حسنة انه رآك وقد بكيت يوماً فسألك هو ومن حضره عن بكائك فقلت مسئلة اعتقدتها منذ ثلثين سنة فتبين لى الساعة بدليلٍ لاح لى ان الامر على خلاف ما كان عندى فبكيت لعل الذى لاح لى ايضاً يكون مثل الاوّل۔ فهذا قولك ومن المحال على الواقف بمرتبة العقل و الفكر ان يستريح او ان يسكن ولا سيما فى معرفة الله تعالٰى فما بالك يا اخى تبقى فى هذه الورطة ولا تدخل طريق الرياضات والمكاشفات والمجاهدات والخلوات التى شرعها رسول الله صلى الله عليه وسلم فتنال ما نال من قال فيه الله سبحانه عبداً من عبادنا اتيناه رحمة من عندنا وعلمناه من لدنا علماً[1]

حُسن عقیدت رکھتا تھا یہ بیان کیا کہ اُسنے تم کو ایک روز روتے ہوئے دیکھا جب اُس نے اور حاضرین نے رونے کی وجہ دریافت کی تو تم نے یہ جواب دیا کہ ایک مسئلہ جس پر تیس برس سے میں اعتقاد جمائے ہوئے تھا اسی وقت ایک دلیل سے مجکو غلط ثابت ہوا اسکے بعد مجکو کیا اطمینان ہی کہ جو تحقیق مجکو اب ظاہر ہوئی ہی وہ بھی پہلے کی طرح غلط نہ ہوگی۔ یہ خود تمہارا قول ہی اور واقعی وہ شخص جو عقل اور استدلال کے مرتبہ سے آگے نہیں بڑھا ناممکن ہی کہ سکون و اطمینان اور راحت حاصل کرلے بالخصوص خدا تعالیٰ کی معرفت میں۔ تو ای برادر پھر بھی تم کیوں اس گرداب (نظر و فکر) میں پڑے ہوئے ہو۔ اور کیوں ریاضات۔ مجاہدات۔ مکاشفات اور خلوات کا وہ طریقہ اختیار نہیں کرتے جسکو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشروع کیا ہی اور جس کا نتیجہ یہ ہی کہ تم بھی وہ چیز حاصل کرلو جو اُس بندے نے کی جس کی نسبت خدا تعالیٰ فرماتا ہی کہ ہم نے اس کو خاص اپنے پاس سے رحمت اور علم عطا کیا۔

حضرت شیخ احمد صاحب سرہندی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ اس مضمون کو ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں۔

بلکہ مقصود آنست کہ نسبت معتقدات

یعنی مقصود یہ ہی کہ لوگ اپنے اعتقادات میں ایسے مضبوط ہوں

---

[1] دیکھو کشکول بہاءالدین عاملی مطبوعہ مصر صفحہ ۱۴۱۔

یقینی و اطمینانی حاصل کنند کہ ہرگز بہ تشکیک زائل نگردد و بایراد شبہہ باطل نہ شود۔ چہ پاے استدلال چوبین است و مستدل بے تمکیں۔ الا بذکر اللہ تطمئن القلوب[۱]"

اور ایسا یقین اور اطمینان حاصل کریں جسکو کوئی شک ڈالنے والا زائل نہ کر سکے اور وہ کسی کے شبہات پیدا کرنے سے جاتا نہ رہے کیونکہ استدلال کے پاؤں لکڑی کے ہوتے ہیں اور مستدل ذرا سی دیر بھی نہیں ٹھہر سکتا خوب آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ کے ذکر سے ہی دل اطمین ہوتے ہیں

ایک اور موقع پر ارشاد فرماتے ہیں۔

"وچنانچہ طور عقل ورائے طور حس ست کہ انچہ بحس مدرک نہ شود عقل ادراک آں می نماید ہمچنیں طور نبوّت ورائے طور عقل ست انچہ بعقل مدرک نشود بتوسل نبوّت درک می آید و ہر کہ ورائے طور عقل طریقے از براے معرفت اثبات نمی نماید فی الحقیقت منکر نبوّة ست و مصادم بداہتہ[۲]"

اور جیسا کہ عقل کا راستہ حواس کے راستہ سے علیحدہ ہے کہ جو چیز حواس سے نہ جانی جائے عقل سے معلوم ہو سکتی ہے اسی طرح نبوّت کا راستہ عقل کے راستے سے علیحدہ ہے یعنی جس بات کو عقل سے دریافت نہیں کر سکتے اس کو نور نبوّة سے جان سکتے ہیں اور جو شخص عقل کے اوپر کوئی اور طریقہ علم کا تسلیم نہیں کرتا وہ درحقیقت نبوة کا منکر اور بداہت کا مخالف ہے۔

ذرا اور آگے چلکر لکھتے ہیں۔

"وبالجملہ طریق ریاضت و مجاہدات در رنگ طریق نظر و استدلال وقتے اعتبار پیدا کند کہ مقرون بتصدیق انبیاء بود۔ علیھم الصّلوات والتسلیمات[۳]۔

اور حاصل یہ ہے کہ ریاضات اور مجاہدات کا طریقہ بھی نظر اور استدلال کے رنگ میں اسوقت قابل اعتبار اور اعتماد کے ہے جبکہ اس کی تصدیق انبیاء علیہم الصلوٰة والسلام کے ذریعہ سے ہو چکی ہو۔

علّامہ ابن خلدون بھی مجدد صاحب کے پورے پورے ہمزبان ہیں۔ وہ مجدد صاحب

---

[۱] دیکھو مکتوبات مجدد صاحب مطبوعہ دہلی صفحہ ۳۳۳ جلد ۱۔ [۲] دیکھو مکتوبات مجدد صاحب صفحہ ۴۲ جلد ۳۔
[۳] " " " صفحہ ۴۲ جلد ۳۔

سے ذرا زیادہ تشریح کے ساتھ اپنے مقدمہ تاریخ میں تحریر کرتے ہیں۔

"فاتّهم ادراكك ومدركاتك في الحصر واتبع ما امرك الشارع من اعتقادك وعملك فهو احرص على سعادتك واعلم بما ينفعك لانه من طور فوق ادراكك ومن نطاق اوسع من نطاق عقلك وليس ذلك بقادح في العقل ومداركه بل العقل ميزان صحيح فاحكامه يقينية لاكذب فيها۔ غير انك لا تطمع ان تزن به امور التوحيد والاٰخرة وحقيقة النبوة و حقائق الصفات الالٰهيّة وكل ماوراء طوره فان ذلك طمع في محال۔ و مثال ذلك مثال رجل راى الميزان الذي يوزن به الذهب فيطمع ان يزن به الجبال۔ هذا لا يدرك على ان الميزان في احكامه غير صادق لكن العقل قد يقف عنده ولا يتعدى طوره حتى يكون له ان يحيط

پس تم اپنے علم اور معلومات کو اس حصر کر دینے میں خطادار سمجھو۔ (کہ جو ہم جانتے ہیں تمام موجودات اُسی میں منحصر ہیں) اور شارع علیہ السلام کے بتلائے ہوئے اعتقادات اور اعمال کا اتباع کرو کیونکہ وہ تم سے زیادہ تمہارے بہی خواہ اور سود و بہبود کو سمجھنے والے ہیں۔ اُنکا علم تمہارے علم سے اوپر اور ایسے ذریعہ سے حاصل ہونیوالا ہے جو تمہاری عقل کے دائرہ سے وسیع تر ہے باقی ہمارے اس کہنے سے عقل اور اسکی معلومات میں کوئی نقص پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ ہم عقل کو ایک میزان صحیح سمجھتے ہیں جسکے احکام یقینی اور جھوٹ سے پاک ہیں ہاں یہ میزان اتنی بڑی نہیں ہو کہ تم اس سے توحیا و آخرۃ کے امور اور نبوّت و صفات الٰہیہ وغیرہ کے حقائق کو وزن کرنے لگو۔ یہ تو ایسا ہی ہو جیسا کہ کوئی شخص ایک سونے چاندی کے تولنے کا کانٹا دیکھے اور اُس میں پہاڑوں کے تولنے کا ارادہ کرنے لگے۔ تو یہ نہ کہا جائیگا کہ ترازو وزن بتلانے کے اعتبار سے درست نہیں ہو بلکہ یہ کہینگے کہ ہر ایک میزان کے واسطے ایک حد ہے جسکے آگے وہ کام نہیں دے سکتی۔ اسی طرح میزانِ عقل بھی ایک خاص موقعہ پر ٹھہر جاتی ہو اور یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ اس سے آگے بڑھکر خدا کی ذات و صفات کا احاطہ کرے۔ کیونکہ خود عقل بھی وجود کے

بالله وبصفاته فانه ذرة من ذرات الوجود الحاصل منه وتفطن فی هذا غلط من يقدم العقل على السمع فی امثال هذه القضايا وقصور فهمه واضمحلال رايه فقد تبين لك الحق من ذلك[1]"۔

ان ذرات میں کا ایک ذرہ ہے جو خدا کی طرف سے فائض ہوتے ہیں۔ اسی جگہ سے تم ان لوگوں کی غلطی کم فہمی اور رائے کی کمزوری کو معلوم کر لو جو عقل کو اس قسم کے معاملات میں سمعیات پر ترجیح دیتے ہیں۔

دوسرے مقام میں لکھتے ہیں۔

"وقد تنبه لذلك زعيمهم ابو علی ابن سينا فقال فی کتاب المبدأ والمعاد ان المعاد الروحانی واحواله مما يتوصل اليه بالبراهين العقلية والمقائيس لانه على نسبة طبيعية محفوظة ووتيرة واحدة۔ فلنا فی البراهين عليه سعة واما المعاد الجسمانی واحواله فلا يمكن ادراكه بالبرهان لانه ليس على نسبة واحدة وقد بسطته لنا الشريعة الحقة المحمدية فلننظر فيها ولنرجع فی احواله اليها[2]۔

اور رئیس الفلاسفہ بو علی سینا نے بھی اس بات پر متنبہ ہو کر کتاب المبدأ والمعاد میں یہ کہدیا ہے کہ روح کو عذاب وثواب ہونے پر تو ہم دلائل اور قیاسات قائم کر سکتے ہیں کیونکہ ایسا ہونا مضبوط قانون طبیعی اور ایک خاص طریقہ کے تحت میں داخل ہے تو اسکے اندر براہین سے ثابت کرنے کی گنجائش نکل سکتی ہے مگر جسمانی اعادہ اور جزا سزا کا محض استدلال سے جاننا ہرگز ممکن نہیں۔ کیونکہ وہ کسی خاص نسبت اور قاعدے کے نیچے واقع نہیں ہے لیکن شریعت محمدیہ حقہ نے اسکے حالات تفصیل کے ساتھ بیان کر دیئے ہیں جسکا جی چاہے اسکی طرف رجوع کر کے دیکھ لے۔

جو علوم نہ بذریعہ عقل کے بلکہ بذریعہ کشف کے معلوم ہوں اُن کی بابت کہتے ہیں۔

"ثم هذا الكشف لا يكون صحيحا كاملا عندهم الا اذا كان ناشيا عن الاستقامة لان

پھر یہ کشف بھی صحیح اور کامل اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک کہ استقامۃ (یعنی شریعت کے احکام پر پورا پورا عمل نہو)

---

[1] دیکھو مقدمہ ابن خلدون مطبوعہ مصر صفحہ ۳۸۴ ۔ ۱۲ [2] دیکھو مقدمہ ابن خلدون مصری صفحہ ۴۵۷ ۔ ۱۲

الکشف قد یحصل لصاحب الجوع والخلوة وان یکن هناك استقامة کالسحرة والنصاری وغیرهم من المرتاضین ولیس مرادنا الا الکشف الناشی عن الاستقامة ومثاله ان المرأة الصقیلة اذا کانت محدبة او مقعرة وحوذی بها جهة المرئ فانه یتشکل فیها معوجا علی غیر صورة وان کانت مسطحة تشکل فیها المرئ صحیحاً[1]۔

ورنہ یونتو بہت سے ریاضت اور خلوت سے صفائی قلب حاصل کرنے والوں کو بھی کشف ہونے لگتا ہی جیساکہ ساحرین۔ نصاریٰ اور اور ریاضت کرنے والے اور ان دونوں کی مثال ایسی سمجھو کہ ایک صاف آئینہ تو محدب اور مقعر (اونچا نیچا) ہو اس میں کسی چیز کا عکس بھی ٹیڑھا ترچھا پڑتا ہے اور ایک آئینہ مسطح (ہموار) ہو اس میں شکل بھی سیدھی اور صحیح صحیح دکھائی دے گی۔

حضرت شیخ شہاب الدین صاحب سہروردی رحمہ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں۔ کہ "عقل اور استدلال کے طریقہ سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ ایسا یقینی نہیں ہوتا جس کا ازالہ نہو سکے"۔ تو گویا اس میں ایک قسم کا تردّد اور اضطراب رہتا ہی اور صوفیہ کرام کے علوم بالکل قطعی اور یقینی ہوتے ہیں یعنی ناپائدار نہیں ہوتے۔ اُن میں اگر کوئی شکّ و شبہ پیدا کرنا چاہے تو ہرگز پیدا نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ وہ تو ایسا ہی کہ گویا اپنی آنکھوں سے ایک چیز دیکھ لی اور اپنے کانوں سے کوئی بات سن لی۔ چنانچہ عوارف میں لکھتے ہیں۔

فما اضطراب لطبائع الاضرب من الجهل فقلوب الصوفیة واعیة لانهم زهدوا فی الدنیا بعد ان

تو یہ اضطراب اور تردد جو طبیعتوں میں دیکھتے ہو یہ بھی جہل کی ایک قسم ہی۔ اس اعتبار سے صوفیوں کے قلوب بہت محفوظ ہوتے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے

---

[1] دیکھو مقدمہ ابن خلدون مصری صہ ۳۹۲ ۱۲

احکموا اساس التقوی فبالتقوی
زکت نفوسھم وبالزھد صفت قلوبھم
فلما عدموا اشواغل الدنیا بتحقیق
الزھد انفتحت مسام بواطنھم
وسمعت آذان قلوبھم۔[1]

تقویٰ اور طہارت کی بنیاد کو مضبوط کرکے زہد اور ترک دنیا اختیار کیا۔ تو تقوی کی وجہ سے ان کے نفس پاک اور زہد کی وجہ سے دل صاف ہوگئے۔ اور جب دنیوی مشاغل کو انھوں نے فنا کردیا تو انکے باطن کے مسامات کھل گئے اور اُن کے دل کے کان سُننے لگے۔

متکلمین کی جماعت میں علامہ علاء الدین علی الطوسی (المتوفی ۸۸۷ھ) نے سلطان محمد فاتح کے حکم سے جو کتاب حکماء کے رد میں لکھی ہو اس کے مقدمہ میں یہ بتلایا ہے کہ ہماری عقل بہت سی اشیاء کی حقیقت دریافت کرنے سے قاصر رہتی ہو۔ بلکہ بڑے بڑے حکماء محسوسات کی ماہیت معلوم کرنے سے عاجز ہوجاتے ہیں۔ تو ہم کو چند ایسے امور کے تسلیم کرنے میں کوئی عذر نہونا چاہیئے جن کی باریکیوں کو اگرچہ ہمنے خود نہیں سمجھا مگر خدا کے ایسے سچّے رسولوں نے ہم کو اُن کی خبر دی ہو جن کی صداقت پر سیکڑوں آیات بینات گواہی دے رہی ہیں۔

کیا ہماری آنکھوں نے اُن تمام چیزوں کو دیکھ لیا ہو۔ جن کو وہ دیکھ سکتی ہیں۔ یا ہمارے کانوں نے اُن تمام آوازوں کو سُن لیا ہو جن کو وہ سُن سکتے ہیں (یا ہمارے ہاتھوں نے تمام اُن چیزوں کو چھو لیا ہے جن کو وہ چھو سکتے ہیں۔ یا ہماری زبان نے تمام اُن الفاظ کو ادا کردیا ہے جن کو ہم ادا کرسکتے ہیں) پھر جب ہمارے ان حواس اور اِن قوتوں نے اپنے مقدورات پر پورا احاطہ نہیں کیا تو کیا وجہ ہو کہ ہماری عقلی قوت کو اپنی ساری معلومات پر کامل تصرف اور قبضہ حاصل ہوجائے۔ یہانتک کہ خدا کی ذات وصفات کے مسائل بھی اس کے قابو میں

---

[1] دیکھو عوارف المعارف مطبوعہ مصر صفحہ ۶ +

آجائیں اور حقائق اشیاء میں سے کوئی حقیقت ایسی نہ رہے جو اس کی دسترس سے اچھوتی ہو۔ ہم دیکھتے ہیں کہ پانی آگ مٹی وغیرہ وہ اجسام جو ہر وقت ہم کو نظر آتے ہیں ان کی حقیقت کے دریافت کرنے میں بڑے بڑے فلاسفر متحیر ہیں۔ افلاطون کہتا ہی کہ یہ بسیط اجسام ہیں اور ارسطو کی جماعت کہتی ہی کہ نہیں ہیولی اور صورت سے مرکب ہیں۔ ویمقراطیس کہتا ہی کہ یہ اجسام ایسے ذرات سے مرکب ہیں جو نہایت چھوٹے اور نہایت سخت ہونیکی وجہ سے قابل تقسیم نہیں ہیں۔ پھر اجزاء جسم کے متناہی اور غیر متناہی ہونے کی حیثیت سے نظام کچھ کہتا ہی اور متکلمین کچھ۔ اسی طرح عقل اور نفس ناطقہ کے بارے میں ہر ایک کا مذہب جداگانہ ہی اور ایک جو دلیل قائم کرتا ہے دوسرا اسکو رد کر دیتا ہے۔ بھلا وہ نفس جو ہر وقت ہمارے پاس رہتا ہے اور وہ اجسام جو شب و روز ہمارے استعمال میں آتے ہیں جب ان کی حقیقت کے معلوم کرنے میں ان اذکیاء کا یہ حال ہے تو غیب کے اسرار اور ملکوت کے دقائق تک ان کی رسائی کی کیونکر اُمید ہو سکتی ہی۔ سواء اسکے کہ اللہ تعالیٰ کے صفات و افعال کی صحیح کیفیت کو وہی شخص سمجھے جس کی تائید خدا کی جانب سے کی گئی ہو یا ایسا شخص اس کی اطلاع کرے جس کے مبعوث من اللہ ہونے پر ہزاروں علامات ظاہر ہو چکی ہوں۔ ورنہ جو احمق نبوّت کے انوار سے مستفید ہوئے بغیر محض اپنی عقل پر بھروسہ کر کے الٰہیات کی کُنہ تک پہنچنا چاہیگا اُس کے اوہام یقیناً اس کی عقل سے سخت مزاحمت کرینگے اور اسکو وہمی اور عقلی چیزوں کے تمیز دینے میں ایسی دشواری پیش آئیگی جس کے انسداد کی کوئی تدبیر اس کے پاس نہ ہوگی۔ ارسطو کا یہ قول نہایت انصاف پر مبنی ہی کہ الٰہیات کے مسائل میں دلائل سے یقین کا مرتبہ حاصل نہیں ہو سکتا۔

باقی جن حکماء نے انبیاء کی تقلید کو چھوڑ کر ان مسائل میں انہماک پیدا کیا اس کی وجہ یہ ہوئی کہ خدا تعالیٰ نے ان کو فطرۃً ذہین بنایا تھا اور اُن کی عقلوں میں ایک قسم کی تیزی

پیدا کی تھی جس کے ذریعہ سے اُنھوں نے ہندسہ اور حساب وغیرہ علوم میں ایسی کامل دستگاہ پیدا کرلی کہ اس اعتبار سے اُن کی جس قدر تعظیم کی جاتی تھوڑی تھی۔ لیکن افسوس اُنھوں نے خدا کے اس انعام کا شکریہ ادا نہیں کیا۔ اور وہ اِس کے پورے پورے مصداق بن گئے۔ ع

اے روشنی طبع تو بر من بلا شدی

اُنھوں نے ایسے لق ودق میدان میں قدم رکھنے کی جرأت کی کہ جو اُن کی فہم و فراست کی سرحد سے بالکل خارج تھا۔ یہانتک کہ وہ خود بے راہ ہوئے اَور اَوروں کو گمراہ کیا۔

آب اُن کے اس حال سے ہر ایک انسان کو چاہیئے کہ عبرت حاصل کرے اور کسی ایسے رسول کے اقوال پر جس کی راستبازی دلیلوں سے ثابت ہو چکی ہو بے چون چرا اعتماد کرکے اپنے دِل کو ان اضطرابات اور شکوک و اوہام سے رستگاری دے۔ وَاللّٰهُ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ؁

آب یہاں پہنچکر ہم کو چاہیئے تھا کہ ہم قلم کی باگ امام غزالی کی تقریر کی طرف پھیر دیتے جس کا حوالہ ہم بہت دور سے دیتے چلے آرہے ہیں کیونکہ اسوقت ہم حکماء اور متکلمین۔ صوفیہ اور مورخین سب کے کلاموں کے انتخاب سے فارغ ہو چکے ہیں اور ہماری تحریر کے پڑھنے والوں میں جو تحریک اس مسئلہ کی بابت ہم پیدا کرنا چاہتے تھے وہ بھی غالباً پیدا ہو چکی ہی۔ لیکن بڑی کوتاہی ہوگی اگر ہم اس موقع پر شاہ ولی اللہ صاحب جیسے یگانہ عصر کو فراموش کر جائیں جن کی نسبت مشہور ہی کہ متاخرین میں ان سے بڑھکر کوئی اس مسئلہ (عقل و نقل) کا سمجھنے والا پیدا نہیں ہوا اور نہ اس اخیر دور میں اُن سے زیادہ کسی نے شریعت کے اسرار اسقدر تفصیل کے ساتھ بیان کئے۔ وہ اپنی مشہور کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں تحریر فرماتے ہیں۔ کہ

ا؎ یہ سب تفصیل کتاب الذخیرہ مطبوعہ دائرۃ المعارف صفحہ ۹ و ۱۰ میں مذکور ہی ۱۲

قد يظن ان الاحكام الشرعيّة غير متضمنة لشئ من المصالح وانه ليس بين الاعمال وبين ما جعل الله جزاءً لها مناسبة وان مثل التكليف بالشرائع كمثل سيد اراد ان يختبر طاعة عبده فامره برفع حجر او لمس شجر مما لا فائدة فيه غير الاختبار فلما اطاع او عصى جوزي بعمله وهذا ظن فاسد تكذبه السنة واجماع القرون المشهود لها بالخير[1]

کبھی یہ خیال کر لیا جاتا ہی کہ شریعت کے احکام عقلی مصالح پر مشتمل نہیں ہیں اور نہ اعمال میں اور انکی پاداش میں کوئی خاص مناسبت ملحوظ ہی اور یہ کہ انسان کو خدا کی جانب سے احکام شرعیہ کا مکلف بنانا ایسا ہی جیسا کوئی آقا اپنے غلام کی فرمانبرداری کا امتحان کرنا چاہی اور اسکو کسی پتھر کے اُٹھا لانے یا کسی درخت کے چھونے یا کسی اور ایسے کام کا حکم کرے جس میں اس کی آزمایش کے سوا کوئی فائدہ نہو۔ اب اگر اُس غلام نے اطاعت کی یا نہ کی تو اُس کو ویسا ہی بدلہ دیدیا گیا۔ شریعت کی بابت یہ خیال بالکل فاسد ہی جس کی تکذیب سنّت رسول اللہ اور قرون اولی کے اجماع نے کی ہی۔

پھر ایک ورق کے بعد یہ بھی لکھتے ہیں۔

نعم كما اوجبت السّنة هذا وانعقد عليه الاجماع فقد اوجبت ايضًا ان نزول القضاء بالايجاب والتحريم سبب عظيم في نفسه مع قطع النظر عن تلك المصالح لاثابة المطيع وعقاب العاصي وانه ليس الامر على ما ظن من ان حسن الاعمال و

ہاں جیسا کہ سنّت اور اجماع سے یہ ثابت ہوا اسی طرح یہ بھی ثابت ہوا ہی کہ خدا کی طرف سے محض کسی چیز کے وجوب یا حرمت وغیرہ کے متعلق حکم کا نازل ہونا بھی مصالح عقلیہ سے قطع نظر کر کے نیکوں کو ثواب اور گنہگاروں کو عذاب دینے کا بڑا سبب ہے اور ایسا نہیں جیسا کہ بعضوں کا گمان ہی کہ اعمال کا حسن و قبح یعنی ان کے کرنے نہ کرنے پر عذاب و ثواب کا استحقاق محض عقل سے ثابت ہو سکتا ہو۔ باقی شریعت کا کام

---

[1] دیکھو حجۃ اللہ البالغہ مطبوعہ مصر صفحہ ۵

قبحها بمعنی استحقاق العامل للثواب والعذاب عقلیان من کل وجہ وان الشرع وظیفتہ الاخبار عن خواص الاعمال علی ما ھی علیہ دون انشاء الایجاب والتحریم بمنزلۃ طبیب یصف خواص الادویۃ وانواع للمرض فانہ ظن فاسد تمجہ السنۃ بادی الرائے[1]

اُس طبیب کی طرح جو دواؤں کے خواص اور مرض کے اقسام کو بیان کرتا ہے صرف یہ ہو کہ وہ اعمال کی واقعی خاصیتوں کو ظاہر کردے نہ یہ کہ وہ اپنی طرف سے کسی چیز کو واجب یا حرام بنائے۔ اِس قسم کے خیالات بالکل فاسد ہیں جن سے کھلے طور پر سُنت رسول اللہ نفرت کرتی ہے۔

یہ تمام اقوال جو یہاں تک نقل کیے گئے اُن مستند علماء کے اقوال ہیں جو بلحاظ اپنے فضل وکمال کے اُمت محمدیہ کے آفتاب اور ماہتاب شمار کیے گئے ہیں۔ اور جن کی فضیلت خواہ کسی حیثیت سے ہو چار دانگ عالم میں تسلیم کی جا چکی ہے۔

لیکن ان متفرق اقوال اور پراگندہ مضامین سے ایک کم علم آدمی بجائے اسکے کہ کچھ فائدہ اُٹھائے سخت پریشانی میں پڑ جاتا ہی اور وہ متعین نہیں کر سکتا۔ کہ میں ان میں سے کس بات کو لوں اور کس کو چھوڑوں۔ اسی تذبذب کے وقت میں امام غزالی آتے ہیں اور احیاء العلوم وغیرہ کے ذریعے سے اُس کی دستگیری کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ گھبراؤ نہیں یہ سب باتیں درست ہیں۔ یہ بھی سچ ہی کہ کسی مذہب حق کے تمام احکام عقل کے مطابق ہیں۔ اور یہ بھی ایک اعتبار سے صحیح ہی کہ نبوۃ اور ولایت کا مرتبہ عقل سے بالاتر ہی۔ یہ بھی غلط نہیں کہ ہر ایک علم عقل ہی کے ذریعہ سے حاصل ہو سکتا ہی اور اس کہنے میں بھی کچھ حرج نہیں کہ بعض علوم عقل کے سواء اور کسی طریقے سے بھی حاصل ہو جاتے ہیں۔ اسکو بھی ہم تسلیم کرتے ہیں کہ

---

[1] دیکھو حجۃ اللہ البالغۃ مطبوعہ مصر صفحہ ٦۔

شریعت کے تمام احکام عقلی مصالح پر مبنی ہیں اور یہ کہنا بھی بیجا نہیں کہ محض عقلی مصالح کسی چیز کے فرض کرنے یا حرام کرنے کیلئے کافی نہیں

ممکن ہو کہ تمھاری کمزور طبیعت ان متضاد بیانات کو دیکھکر گھبرا اُٹھے اور تم ان پیچیدہ مقدمات کو کوئی منطقی طلسم سمجھنے لگو۔ مگر جو جامع مانع تقریر ہم عنقریب درج کرینگے اُس کو پڑھکر تمھاری تسلّی ہو جائیگی۔ اور تم یقین کر لوگے کہ ان اقوال میں لفظی نزاع کے سوا کوئی حقیقی اختلاف سمجھنا ہمارے فہم کی تقصیر ہے۔

تم سب سے پہلے اس پر غور کرو کہ انسان کو قدرت نے دوسرے حیوانات سے کون سی امتیازی حالت عطا کی ہی کیا قدرت۔ ارادہ۔ خوف۔ رجا۔ شہوۃ۔ غضب یہ صفات جو انسان میں رکھی ہوئی ہیں اور حیوانات میں نہیں ہیں یا آنکھ۔ ناک۔ کان۔ زبان۔ دست و پا جو اعضا انسان کو عنایت کئے گئے ہیں اوروں کو نہیں دئے گئے۔ یا حسِ مشترک۔ خیال۔ وہم۔ حافظہ وغیرہ حواس باطنہ جو انسان میں ودیعت کئے گئے ہیں دوسروں کے حصّہ میں نہیں آئے۔ تم یقیناً کہوگے کہ ان سب چیزوں کے اعتبار سے انسان کو کوئی فضیلت اور جانوروں پر حاصل نہیں ہی۔ بلکہ بسا اوقات بعض جانور اِن بعض قوتوں میں انسان سے بڑھے ہوے نظر آتے ہیں۔ تو پھر وہ کیا خصوصیت ہے جس کی وجہ سے انسان کی شرافت جانوروں کے مقابلہ میں تسلیم کر لی گئی اور وہ کیا علامات ہیں جو انسان کے روشن چہرہ کے امتیازی خط و خال ہیں۔

اس کے جواب میں ہم بجز اُن دو چیزوں کے کسی کا نام نہیں لے سکتے جن کا اختصار علم اور ارادہ کے دو چھوٹے چھوٹے لفظ کرتے ہیں اور جن کی تشریح میں ہم کو اپنے ناظرین کے وقت کا ایک معتد بہ حصّہ لینا پڑیگا علم سے ہماری مراد وہ علم ہی کہ جس کی بدولت دنیا اور آخرۃ کے حالات منکشف ہوتے ہوں اور وہ کائنات کے حقائق کو اُن کی اصلی صورت

میں ہمارے سامنے پیش کرتا ہو۔ اور ارادہ کے لفظ سے ہم نے اُس ارادہ کا قصد کیا ہی جو نفسانی خواہش کے اشارہ پر نہیں بلکہ علم کے اشارہ پر چلنے والا ہی۔ کیونکہ جو ارادہ قوۃ شہوانی کی تحریک سے پیدا ہوتا ہی وہ تو تمام حیوانات میں موجود ہی۔ ہر جاندار بھوک اور پیاس کے وقت دانہ پانی کی طلب میں دوڑتا ہی شہوۃ کے غلبہ کیوقت اُس کے فرو کرنیکا ارادہ کرتا ہی۔ اپنے دشمن کے مقابلہ میں پوری طاقت اور زور آزمائی دکھلاتا ہی۔ تو کیا ان سب حالتوں میں ارادہ نہیں پایا گیا۔ لیکن ہاں وہ ارادہ نہیں جو افراد انسانی کی خصوصیات میں سے ہی۔ انسان کی خصوصیت یہ ہی کہ وہ شہوانی میلان کے خلاف بھی اگر اسکی عقل ہدایت کرے حرکت کر سکتا ہو۔ اور اپنے فعل و ترک میں جی چاہنے نہ چاہنے کا پابند نہو۔

یہ ارادہ اور وہ علم جس کا ذکر پہلے ہوا۔ بزرگترین مخلوقات یعنی انسان کے ساتھ مختص ہیں اور ان ہی دو نشانیوں سے انسان حیوانات سے اور بڑا آدمی بچوں سے باعتبار اپنے کمال کے پہچانا جاتا ہی۔ بچہ جب اپنی پیدائش کے مدارج طی کرتا ہوا رحم مادر سے باہر آتا ہی تو وہ نہ بھلے بُرے۔ نیک بد اور نافع مضر کی تمیز رکھتا ہی اور نہ اس کا کوئی ارادہ کسی قانون عقلی کا تابع ہوتا ہی۔ اور جوں جوں اس کے قویٰ میں نشو و نما۔ اس کے علم میں ترقی۔ اس کی معلومات میں وسعت پیدا ہوتی جاتی ہی اُسی قدر اس کے افعال و اعمال فہم و دانش کے قاعدوں میں منضبط ہوتے جاتے ہیں۔ اب اگر اسکا علم سچا ہی اور اس کی عقل نے جو فتوے نافذ کئے ہیں وہ صحیح ہیں تو اس کے سب عمل درست ہو سکتے ہیں اور اگر اس کی عقل نے لغزش کھائی۔ نافع کو مضر۔ مضر کو نافع یا نیک کو بد بد کو نیک سمجھ لیا تو ہرگز توقع نہیں کہ وہ اپنی حرکات و سکنات میں کج روی و غلطی سے محفوظ رہے اس صورت میں ہر انسان پر واجب ہے کہ وہ صحیح علم کے حاصل ہونے کے ذرائع سوچے اور تا زیست اپنے اندر ان کے پیدا کرنیکی کوشش کرے

لیکن جس حد تک غور کیا گیا علم کی حقیقت اس سے زیادہ معلوم نہیں ہوئی کہ کسی چیز کا نقشہ ایسی طرح ہماری عقل میں کھنچ جائے جیسا کہ آئینے میں کسی شی کی تصویر نظر آنے لگتی ہی۔ دیکھو اگر کوئی شخص ہماری نظر سے گذرا۔ یا ایک شاندار مکان ہم نے کسی جگہ دیکھا اور کچھ دیر کے بعد ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ تو پھر ہم جب کبھی اُس شخص یا اُس مکان کو دیکھتے ہیں فوراً شناخت کر لیتے ہیں کہ یہ وہی شخص اور وہی مکان ہی۔ اگر ہمارے پاس کوئی ایسا نقشہ جو اس مکان یا اس شخص پر پورا پورا منطبق ہو موجود نہوتا تو اور کونسا معیار تھا جسکے ذریعہ سے اتنی مدت کے بعد ہم کو یہ شناخت ہو گئی۔ اس سے صاف طور پر ثابت ہوتا ہی کہ آدمی کا ذہن (عقل) مثل ایک آئینہ کے ہی اور اس میں جو معلومات حاصل ہوتے ہیں وہ اُس عکس کی مانند ہیں جو کسی شی کے محاذات کے وقت آئینہ میں دکھائی دیتا ہی۔ اِتنا فرق ہی کہ آئینہ میں صرف اُن اشیاء کا عکس پڑتا ہی جو آنکھوں سے نظر آنے کے قابل ہوں اور ذہن میں ہر قسم کی چیزیں متنقش ہو جاتی ہیں۔ مثلاً کسی اسپیکر کی ایک لمبی چوڑی تقریر تم نے سُنی اور اس کے مضامین کا خلاصہ تم نے اپنے ذہن میں ملحوظ رکھا۔ تو اب جب کبھی کوئی شخص وہ تقریر کریگا تم فوراً سمجھ جاؤ گے کہ یہ بعینہ وہ مضامین ہیں جو فلاں اسپیکر نے بیان کئے تھے۔ اگر اُن مضامین کا کوئی فوٹو تمہارے پاس نہیں تھا تو تم نے یہ کیسے جانا کہ وہ اور یہ تقریر ایک ہی ہیں۔ اِس سے بدیہی طور پر معلوم ہوا کہ ہمارے ذہن میں ان مضامین کا کوئی خاکہ موجود تھا۔ حالانکہ ان ہی مضامین کا عکس اگر ہم آئینہ میں لینا چاہیں تو بالکل ناممکن ہی۔

غرض آئینہ میں اور ذہن میں اتنا تفاوت ہی کہ ایک میں مخصوص چیزوں کا عکس آتا ہی اور دوسرے میں ہر چیز کا مگر دونوں میں اسقدر اشتراک ہی کہ اُس میں بھی کسی چیز کی تصویر حاصل ہوتی ہی اور اس میں بھی۔ اب اگر کوئی چیز آئینہ میں منعکس ہونے کے قابل ہو لیکن منعکس نہ ہو تو

جہانتک تتبع اور استقراء سے معلوم ہوا اس کے پانچ وجوہات ہو سکتے ہیں۔ یا یہ کہ وہ جوہر (لوہا) جس سے آئینہ بنتا ہی اُس نے ابھی تک صیقل ہو کر آئینہ کی صورت اختیار نہیں کی۔ یا آئینہ بن چکا مگر زنگ آلود ہو گیا۔ یا صاف و شفاف ہی مگر جس چیز کا عکس اس میں لینا چاہتے ہو وہ اس کے مقابل نہیں۔ یا مقابل بھی ہی مگر آئینہ کے اور اُس شی کے بیچ میں کوئی دوسری شی حائل ہی۔ یا عکس لینے والے کو یہ معلوم نہیں کہ اس صورت کا عکس کس جہت میں ہو کر لیا جا سکتا ہی۔ ان سب حالتوں میں اشیاء مطلوبہ کا عکس آئینہ میں نہیں آسکتا اور اگر ان موانع میں سے کوئی مانع موجود نہ ہو تو پھر محال ہی کہ محسوسات کی صورت اُس میں ظاہر نہ ہو۔

ٹھیک اسی طرح انسان کے قلب (عقل) کی حالت ہی۔ کبھی تو ایسا ہوگا کہ خود قلب ابھی ناقص ہی اور انعکاس کی پوری قابلیت اس میں پیدا نہیں ہوئی۔ جیسا کہ شیرخوار بچہ کا قلب کہ وہ معقولات کے علم سے بالکل خالی ہوتا ہی۔ اور کبھی معاصی اور ناپاک افعال کے ارتکاب سے قلب پر ایک قسم کی کدورت اور ظلمت چھا جاتی ہی جس کی وجہ سے اس کی پوری جلا اور صفائی باقی نہیں رہتی۔ اسلئے اس میں لطیف اور باریک چیزوں کا انعکاس نہیں ہوتا اور خدا کی ذات وصفات اور غیب کے اسرار سے یہ قلب بالکل عاری رہتا ہی۔

اس قلب کے زنگ چھوڑانے کی اس کے سوا کوئی تدبیر نہیں کہ وہ ہمہ تن خدا کی طاعت کی طرف توجہ اور مقتضائے شہوات سے پورا پورا اعراض کرے۔ اور مجاہدات کا وہ طریقہ اختیار کرے جو اس فن کے تجربہ کاروں نے ناجائز خواہشات کے استیصال کے واسطے تلقین کیا ہی۔ والذین جاهدوا فینا لنهدینهم سُبُلَنا اور من عمل بما علم ورثه الله علم ما لم یَعلم میں اسی راز کی طرف اشارہ ہی۔

لیکن کبھی آدمی کا قلب گناہوں کی آلایشوں سے پاک وصاف ہوتا ہی اور پھر بھی اس میں علوم ذات وصفات اور حقائق اشیاء مرتسم نہیں ہوتیں اس کی وجہ یہ ہوتی ہی کہ اس کی توجہ ان چیزوں کی طرف کامل نہیں ہوتی بلکہ وہ آفات نفس کے جاننے یا طرق معاش کے مہیا کرنے میں مثلاً مصروف ہوتا ہی تو وہ چیزیں جن کی طرف اس کے قلب کو توجہ نہیں ہی اسی طرح منعکس نہیں ہوسکتیں جس طرح آئینہ میں وہ صورتیں جو اس کے محاذی نہ ہوں۔ تاہم قلب کبھی صاف بھی ہوتا ہی اور توجہ بھی کامل ہی مگر وہ فاسد عقائد جو تقلید یا حسن ظن کی بنا پر دل میں پہلے سے راسخ ہیں حقائق کے انعکاس کے لئے حجاب بن جاتے ہیں اور جیسا کہ آئینہ اور شی مطلوب کے درمیان میں اگر کوئی شی حائل ہو جائے تو اسکا عکس اس میں نہیں پڑتا ایسے ہی حجاب کے وقت ہماری عقل حقیقی علوم کے حاصل کرنے سے قاصر رہتی ہی۔ اور کبھی علم کے یہ تمام سامان جمع ہوتے ہیں مگر جن حاصل شدہ علوم پر یہ علم متفرع ہوتا ہے۔ ان میں مناسب ترتیب قایم کرنی ہم کو نہیں آتی اس لئے ہم علم سے محروم رہتے ہیں۔ اسکی مثال یہ ہی کہ ایک شخص اپنی گدّی کے پیچھے کا حال آئینہ میں دیکھنا چاہے۔ اب اگر وہ آئینہ کو آنکھوں کے سامنے رکھتا ہی تو پیچھے کا حال اس میں کھل نہیں سکتا اور اگر پیچھے لیجاتا ہی تو گو انعکاس ہو جاتا ہی مگر آنکھیں اس عکس کو دیکھ نہیں سکتیں۔

اُس وقت یہ شخص باوجود تمام اسباب مہیا ہونے کے عکس کے دیکھنے سے اسلئے محروم ہی کہ اس کو اسکے عکس لینے کا طریقہ معلوم نہیں۔ اگر کوئی اس کو یہ بتلا دے کہ ایک آئینہ پیچھے لیجاؤ اور ایک آئینہ اس آئینہ کے محاذات میں اس طرح سامنے رکھو کہ جو عکس اُس آئینہ میں پڑے اُسی عکس کا پرتوہ دوسرے آئینہ میں بھی آجائے تو اس طریقہ کے معلوم ہونے سے اس کی ساری مشکل حل ہو جائیگی۔ اور جو دقتیں اس عکس کے لینے میں وہ اُٹھا رہا تھا وہ یک لخت جاتی رہیں گی۔

یہی حال بعینہ انسان کے قلب کا سمجھو اور یقین کرلو کہ یہی امور ہیں جو اکثر حقائق کی معرفت سے ہمکو بے بہرہ رکھتے ہیں۔ اگر یہ موانع نہ ہوں تو بیشک ہر قلب اس فیض علم کے حاصل کر لینے کی پوری قابلیت رکھتا ہی جو فیاض ازل کی طرف سے بغیر کسی بخل کے ہر وقت اور ہر آن جاری ہی۔

تو جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ سچے مذہب کے احکام عقل کے مطابق ہوتے ہیں اُنکا یہ قول اس اعتبار سے بالکل صحیح ہی کہ ایک کامل اور صاف و شفاف عقل جس میں حقائق کے انعکاس کی سب شرائط موجود ہوں ہرگز خدا کے حکم کے خلاف حکم نافذ نہیں کر سکتی۔ اور جنہوں نے یہ کہا ہی کہ احکام خداوندی کو اپنی عقل کی میزان میں نہ تولو۔ اُن کی غرض یہ ہی کہ ہماری زنگ آلود عقلوں میں خدائی اسرار کا انعکاس نہیں ہو سکتا۔ اِسی طرح جس فریق کا یہ خیال ہی کہ حقائق نبوّت اور حقائق صفات الٰہیہ ہماری فہم و ادراک سے بالاتر ہیں وہ عام فہم اور ادراک کے لحاظ سے بالکل سچ کہتے ہیں اور جس شخص کا یہ قول ہی کہ نہیں یہ چیزیں بھی بذریعہ عقل انسانی کے دریافت ہو سکتی ہیں تو اس کا مدعی بھی غلط نہیں ہی۔ وہ بجا طور پر عقل انسانی اسی کو قرار دیتا ہی جس میں نفسانی کدورتیں اور آلائشیں نہ ہوں۔

غرض نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد کہ لوگ درجات عقل کے موافق جنت میں جائینگے اس پر محمول ہی کہ حقیقی عقل کو جسقدر ترقی ہوگی جنت کے دروازوں سے قرب ہوتا جائیگا۔ اور یہ مقولہ کہ اکثر اہل جنت بے عقل ہونگے۔ اس میں وہ لوگ مراد ہیں جو دنیا کے کاموں میں متوجہ نہ ہونے کی وجہ سے ابلہ سمجھے جاتے ہیں اور علیکم بدین العجائز کا خطاب بھی انہیں سے ہے جن کے دماغ دقیق اسرار کے متحمل نہیں ہو سکتے۔

اب تم پھر ایک دفعہ اُن متعارض اقوال کو یاد کرو جن کے سلجھانے میں تم سخت پریشان تھے اور جن کی کوئی درست توجیہ تم سے بن نہ پڑتی تھی۔ اور اخیر میں امام صاحب کی اس زرّیں

نصیحت کو خوب یاد رکھو۔ کہ

فلا غنا بالعقل عن السماع ولا غنا بالسماع عن العقل فالداعی الی محض التقلید مع عزل العقل بالکلیة جاهل والمکتفی بمجرد العقل عن انوار القرآن والسنة مغرور فایاک ان تکون من الفریقین وکن جامعا بین الاصلین فان العلوم العقلیة کالاغذیة والعلوم الشرعیة کالادویة والشخص المریض یستضر بالغذاء متی فاته الدواء فکذلک امراض القلوب لا یمکن علاجها الا بالادویة المستفادة من الشریعة وهی وظائف العبادات والاعمال التی رکبها الانبیاء صلوات الله علیهم لاصلاح القلوب فمن لا یداوی قلبه المریض بمعالجات العبادة الشرعیة واکتفی بالعلوم العقلیة استضر بها کما یستضر المریض بالغذاء وظن من یظن ان العلوم العقلیة مناقضة للعلوم الشرعیة وان الجمع بینهما غیر ممکن ظن

نہ عقل کو نقل سے استغنا اور نہ نقل عقل سے بے نیاز ہے جیسا کہ عقل کو معزول کر کے محض تقلید کی طرف بلانے والا جاہل ہے اسی طرح وہ شخص بھی دھوکہ میں ہے جو قرآن و سنت کے انوار سے علیحدہ ہو کر صرف اپنی عقل پر بھروسہ کرے تو تم کو ان دونوں گروہوں میں سے کسی میں بھی داخل نہ ہونا چاہیئے۔ بلکہ عقل و نقل کا جامع بننا چاہیئے کیونکہ علوم عقلیہ عقل کی غذا اور علوم شرعیہ اسکی دوائیں اور جو مریض دوا کا استعمال نہ کرے اس کو غذا کے استعمال سے نقصان پہنچ جاتا ہے۔ یہی حالت دل کے امراض کی ہے کہ اُن کا علاج شرعی دواؤں سے یعنی اُن عبادات اور اعمال سے ہی ہو سکتا ہے جن کو انبیاء علیہم السلام نے اس کام کیلئے ترکیب دیا ہے۔ پس جس کا دل بیمار ہو اور وہ طب شرعی کے بموجب اسکا معالجہ بھی نہ کرے اور علوم عقلیہ کو اپنے حق میں کافی سمجھے وہ اسی طرح ہلاک ہوگا جس طرح بیمار آدمی غذا سے ہلاک ہو جاتا ہے۔ باقی جو لوگ سچے علوم عقلیہ کو علوم شرعیہ کے خلاف تصور کرتے ہیں۔ اور دونوں میں تطبیق کو محال سمجھتے ہیں۔ یہ اُن کا خیال اس وجہ سے ہے کہ اُن کی بصیرت کی آنکھیں

صادر عن عمی فی عین البصیرة۔	اندھی ہیں۔
نعوذ باللہ منہ۔	(خدا کی پناہ)

یہاں تک ہم نے امام غزالیؒ کی تقریر کا ماحصل نقل کر دیا۔ امام صاحب کی تقریر اگرچہ نہایت صاف نہایت سلیس۔ نہایت عام فہم اور نہایت پُر اسرار ہی لیکن اس میں چند ایسے اقناعی مقدمات بھی ہیں جن کا انکار کر دینا ہمارے ایک بیباک حریف سے کچھ مستبعد نہیں ہی۔

ہم امام صاحب کے اس قابل قدر بیان کی بہت کچھ عزت کر سکتے ہیں۔ لیکن ہمارا ایک ظاہر پرست اور آزاد منش مقابل اس پر یہ نکتہ چینی کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اگر ہم ذہن میں صورتوں کا انعکاس تسلیم کر لیں تو جو شرائط آئینہ میں انعکاس کے واسطے قرار دی گئی ہیں اُن سب کا ذہن میں پایا جانا کیوں ضروری ہی۔ یہ ہم نے مانا کہ ذہن میں اور آئینہ میں ایک حد تک مشابہت پائی جاتی ہی۔ مگر ان دونوں میں تفاوت بھی بڑا انتہا ہی جس کا اعتراف تم بھی پہلے کر چکے ہو۔ اب اگر اس تفاوت کی بنا پر بعض وہ شرطیں جو آئینہ میں ضروری ہیں حصول علم میں ضروری نہ ہوں۔ یا اسکے برعکس تو کیا مضائقہ ہی۔

اسکے سوا یہ بھی ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ اعمال بد کی مباشرت یا گناہوں کے ارتکاب سے قلب پر کسی قسم کی تاریکی آجاتی ہی۔ اوّل تو ہم اعمال کی تقسیم نیک و بد کی طرف تسلیم ہی نہیں کرتے۔ دوسرے معاصی میں ملوث ہونا بیشک قوت عملیہ کے سُست یا فاسد ہونیکا نتیجہ ہی۔ لیکن قوت علمیہ کا اس اثر بد سے متاثر ہونا بظاہر کوئی معنی نہیں رکھتا۔ نیز بقول قاضی ابن رشد اندلسی کے قرآن پاک نے جابجا قیاس اور نظر کے طریقوں پر متنبہ کیا ہی اور خود بھی مختلف مواقع میں استدلال سے کام لیا ہی۔ پس اگر شریعت کے احکام عقول عام سے بالاتر تھے تو قرآن نے ہم سب کو عقل سے کام لینے اور غور و فکر کرنیکی طرف کیوں توجہ دلائی۔

اور بقول سرسید کے ہر ایک انسان کو ایسے احکام کا مکلف بنانا کیونکر صحیح ہوا جو اس کی سمجھ سے باہر تھے۔ حالانکہ انسان اپنے ذی عقل ہونیکی وجہ سے ہی تکلیف شرعی کا مستحق ہوا ہی یہ اور اسی قسم کے اور شبہات ہیں جن کو سن کر ہم صرف اتنا ہی کہنا چاہتے ہیں کہ شعر

چو بشنوی سخن اہل دل مگو کہ خطاست　　　سخن شناس نئی دلبرا خطا اینجاست

اور بپاس خاطر معترض امام صاحب کے جادہ استدلال سے ہٹ کر یا آگے بڑھکر اس زبردست فاضل کی تقریر کی طرف رجوع کرتے ہیں جس کی تصنیفات میں جتنا غور کرو اتنا ہی اس کی وہبی دانشمندی اور صادق البیانی کا اعتراف لازم ہی۔ یہ وہ فاضل ہی کہ جسکو اگر ہم اپنے عہد کا شیخ اکبر امام غزالی اور شاہ ولی اللہ سب کچھ کہدیں تو بیجا نہیں۔ اور یہی وہ فاضل ہی جس نے علم کلام کی ایک ایسے انوکھے طرز میں بنا ڈالی جو (انشاء اللہ) قیامت تک کے واسطے پتھر کی لکیر ہی اور جس پر ہمارا ناز کبھی ختم نہیں ہوسکتا۔

اس فاضل نے جس کو عام طور پر مولانا **محمد قاسم** صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے لقب سے یاد کیا جاتا ہی اپنی مختلف کتابوں میں جو مفید بیانات درج کئے ہیں وہ اس مسئلہ عقل نقل میں ہماری بہت زیادہ مشکلکشائی کرتے ہیں اور اب ہم ذیل میں جو کچھ لکھیں گے وہ تمامتر انہی تصانیف سے ماخوذ ہوگا۔ **شعر**

مطرب ترانۂ دگر از پردہ ساز کن　　　زیرا کہ حرف عشق نمیدارد انتہا

صحیفۂ عالم کا وسیع مطالعہ کرنے سے یہ بات بخوبی روشن ہوچکی ہی کہ (بقول طبعیین کے فطرت نے اور بخیال اہل مذاہب کے) خدائے مختار نے دنیا کی کوئی چیز بیکار نہیں بنائی اور جوں جوں تحقیقات کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہی ووں ووں ہر ایک چھوٹی بڑی چیز کے منافع ہم پر ظاہر ہوتے جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے کائنات کا ہر ہر جزو بیش قیمت حکمتوں کا مجموعہ ہی

لیکن اس کے ساتھ ہی ہر شی کا تعلق کسی نہ کسی ایسی ایک یا چند اغراض سے بھی ہوتا ہی جنکی کمی زیادتی پر اُس شی کا کمال اور نقصان منحصر ہی اور جن کو ہم اُس شی کے اصلی اغراض کہہ سکتے ہیں۔ مثلاً حیوانات میں گھوڑے کی مدح و ذم اور اُس کا حُسن و قبح رفتار پر موقوف ہے۔ اگرچہ وہ گدھے کی طرح پالان بھی اُٹھا سکتا ہی اور گائے بکری کی طرح اسکو ذبح کرکے کھا بھی سکتے ہیں۔ اور اُس کا دودھ بھی پی سکتے ہیں۔ لیکن یہ اس کے دودھ کی افراط یا بدن کی فربہی۔ یا باربرداری کی طاقت اس کی قدر و قیمت میں اسی طرح کچھ زیادہ دخیل نہیں۔ جس طرح گائے اور بھینس میں چونکہ مقصود اعظم دودھ گھی وغیرہ ہی اس لئے اُن کی تیز رفتاری اور قدم بازی کا کوئی اثر ان کی بھلائی بُرائی پر نہیں پڑتا۔ یا گلاب کے پھول کی حُسن و خوبی اُس کے رنگ و خوشبو سے ہی۔ ذائقہ سے کچھہ بھی غرض نہیں ہوتی۔ یا آنب کے ذائقہ سے سروکار ہی اس کے رنگ اور خوشبو سے چنداں تعرض نہیں کیا جاتا۔ ایسے ہی کتاب سے اگرچہ ہم کسی وقت تکیہ کا کام لے سکتے ہیں۔ لیکن غرض اصلی اُس سے پڑھنا ہی ہوتا ہی۔ یا ضرورت کے وقت کپڑوں کو جلا کر کھانا پکا سکتے ہیں۔ مگر اہم مقصد اُن سے یہی ہی کہ وہ آدمی کے بدن کی پردہ پوشی اور زینت کا سبب بنیں۔

غرض عالم کے تمام اجزاء پر نظر ڈالی جائے۔ ہر موقعہ پر یہی شان نظر آئیگی۔ پھر ناممکن ہی کہ انسان جو ہمیشہ اپنے اشرف المخلوقات ہونے کا دعویٰ کیا کرتا ہی کسی ایسی غرض اعلیٰ اور مطلب اعظم سے خالی ہو۔ جس کے ہونے نہ ہونے پر اس کی بھلائی بُرائی موقوف ہو اور جس کے ذریعہ سے وہ مدح و ستایش یا ہجو و مذمت کا مستحق سمجھا جائے۔

بیشک اس مقصد اعظم کے متعین کرنے میں ہمکو سخت دشواری پیش آئیگی۔ لیکن ہم اس عقدہ کو خود اعضاے انسان کی بناوٹ اور اسکے قویٰ کی ترکیب سے حل کرینگے اور ہم یقین کرتے ہیں کہ

خود انسان زبان حال سے اس مقصد کی جستجو میں ہماری رہنمائی کریگا۔

ہم جب اس معجون مرکب (انسان) کی اندرونی وبیرونی حالتوں میں غور کرتے ہیں تو یہ ظاہر ہوتا ہی کہ ان پانچ چیزوں سے اس کی ترکیب عمل میں آئی ہی۔ عقل یعنی قوۃ علمیہ۔ شوق یا خوف ارادہ اور اختیار۔ قدرت اور طاقت۔ ہاتھ پاؤں آنکھ ناک وغیرہ اعضاے جسمانی۔ چنانچہ جس قدر کام انسان کرتا ہی اُن میں یہ پانچوں آلات اپنا اپنا عمل کرتے ہیں۔

فرض کرو کہ ایک شخص شب کے وقت ایک جنگل میں چلا جا رہا ہی۔ اُس نے دور سے اپنے راستہ پر کسی جانور کو دیکھا۔ جس کی نسبت کبھی تو اس کا یہ خیال ہوتا ہی کہ یہ شیر ہی اور کبھی سمجھتا ہی کہ کوئی بیل کھڑا ہی۔ اب فطرۃً انسان کا پہلا کام یہ ہی کہ وہ اپنے نفع اور ضرر کے پہلوؤں کو سوچے۔ اگر اس پر ضرر کا پہلو متعین ہو گیا یعنی یہ کہ پھاڑ کھانے والا شیر ہی تو طبعاً اس پر ایک قسم کے خوف یا اجتناب کی کیفیت طاری ہوگی اور اس کی وجہ سے وہ وہاں سے بھاگنے کا ارادہ کریگا۔ اور اس ارادہ سے اس کی قدرت اور طاقت تحریک میں آئیگی۔ اور اگر اعضاء جسمانی قابو میں ہوئے تو اُلٹے پاؤں وہاں سے بھاگنا شروع کر دیگا۔ اور اگر یہ شخص اس جانور کو شیر نہ سمجھتا یا شیر سمجھکر ایذا پہنچانے والی چیز نہ تصور کرتا تو برابر اپنے شوق میں اُدھر بڑھا چلا جاتا۔

اس سے یہ امر بدیہی طور پر ثابت ہوا کہ شوق اور خوف۔ ارادہ اور اختیار۔ طاقت اور قدرت ہاتھ اور پاؤں وغیرہ (جنکے مجموعہ کو ہم قوت عملیہ سے تعبیر کرتے ہیں) سب کے سب عقل یعنی قوۃ علمیہ کے محکوم اور زیر فرمان ہیں۔ اور جب عقل مفرد (قوۃ علمیہ) کا کام نافع ومضر کی شناخت یا نیک و بد کی تمیز اور قوت عملیہ کا کام حسب اشارۂ عقل کسی عمل کا وجود میں لانا ٹھہرا تو اوّل کی حکومت اور دوسرے کی محکومی کے لحاظ سے اِن دونوں کے مجموعہ یعنی انسان کا کل کام یہ ہوا کہ وہ سوچ سمجھکر

مفید مشاغل میں پڑے اور مضر کاموں سے بچے۔ اور یہ اُسی وقت ہو سکتا ہی جب کہ دنیا میں اعمال کی تقسیم نیک و بد یا نافع و مضر کی طرف ہو سکتی ہو۔ کیونکہ اگر عملی دنیا سے بھلے بُرے کا فرق بالکل اُٹھا دیا جاے تو قوۃ علمیہ کے کارناموں کے لئے کوئی میدان ہاتھ نہ آئیگا جیسا کہ ہم ابھی بتلا چکے ہیں کہ قوت علمیہ صرف یہی کام کر سکتی ہی کہ مفید اور بہتر کاموں کا ناقص اور مضر کاموں سے انتخاب کرتے رہے اور قوۃ علمیہ کی اس کارگزاری کے لئے دو قسم کے اعمال کا اس کے سامنے پیش ہونا ضروری ہی۔

اب چونکہ یہ ثابت ہو گیا کہ اعمال کی دو قسمیں کئے بغیر انسان کی خلقت ہی بیکار رہتی ہی تو اس کا بھی سراغ نکل آیا کہ تمام عالم ہمیشہ سے اس پر متفق کیوں ہی کہ اعمال دو طرح کے ہوتے ہیں۔ نیک اور بد یا دوسرے الفاظ میں نافع اور مضر۔ یہانتک کہ جو ملحد کسی مذہب کے قائل نہیں وہ بھی افعال و اعمال کی اس بدیہی تفریق کو تسلیم کرتے ہیں۔

اب جو کچھ گفتگو باقی ہی وہ صرف اسمیں ہی کہ اعمال میں نیک و بد اور نافع و مضر کی تعیین کس طور پر کی جلائے یعنی یہ کس طرح معلوم ہو کہ یہ فعل اچھا ہی یا بُرا۔ اس سے راحت پہونچے گی۔ اس سے تکلیف۔ لیکن خوش قسمتی سے جو تقریر مرقوم ہوئی اس سے اس سوال کا جواب بھی کافی حد تک نکل آیا۔ کیونکہ جب عقل یا قوۃ علمیہ اس لئے پیدا ہوئی ہی کہ وہ بھلے اور بُرے یا مفید اور مضر اعمال میں امتیاز قایم کیا کرے۔ تو یقیناً قدرت نے اس میں اس امتیاز صحیح کا ملکہ ودیعت کیا ہوگا۔ اس وجہ سے یہی رائے مضبوط معلوم ہوتی ہی کہ عقل سلیم جس کام کا حکم کرے وہ نافع ہو اور جس سے وہ انکار یا گریز کرے اس میں کوئی مضرت ہو۔

یہاں سے اس کی بھی قوی اُمید ہوتی ہی کہ اگر خدا کی جانب سے بندوں کی ہدایت کے لئے کچھ احکام نازل ہوں (جن کے مجموعہ کو مذہب کہتے ہیں) تو وہ بھی مو بمو عقل کے موافق

ہوں ورنہ خدائے برتر کی دانائی اور متانت پر یہ الزام عائد ہوگا کہ اُس نے عقل کو بھی ہمارے قویٰ پر حکومت عطا کی تاکہ وہ سب اس کے اشاروں پر کام کریں اور رسول کو بھی حاکم بناکر بھیجا تاکہ اس کی اطاعت کی جاوے۔ اور ساتھ ہی دونوں کو متضاد بلکہ متناقض احکام بھی دیدئے جن میں سے ایک کو قبول کرتے ہیں تو لازمی طور پر دوسرے سے سرتابی کرنی پڑتی ہی۔

غرض اب نہایت باوثوق طریقے سے یہ طے ہوگیا کہ سچا مذہب وہی ہی جو عقل سلیم کے مطابق ہو۔ اور بقول قاضی ابن رشد کے ہر اُس شخص کو جس کے پاس عقل سلیم موجود ہی اپنی عقل سے کام لینا اور نظر و فکر کے صحیح طریقوں میں غور کرنا چاہیئے۔

اور بیشک تمام قرآن اور تمام احادیث کا یہی منشاء ہی کہ وہ عقل کے دستور العمل کے موافق تعلیم دین۔ اور ہر انسان کی عقل جب تک کہ وہ گرد وپیش کے خیالات سے متاثر نہ ہو اور جب تک کہ عقلی صحت کا زائل کر دینے والا کوئی مرض اسکو لاحق نہ ہو اُن ہی سچے اعمال کی ہدایت کرے گی جن کے رواج دینے کے واسطے خدا کے صادق القول پیغمبر مبعوث ہوئے ہیں۔

لیکن ان تمام مراحل کے بعد بھی ہم کو جس مرحلہ کا طے کرنا ہنوز باقی ہی وہ یہ ہی کہ عقل کے ساتھ سلیم کی قید بڑھانے سے یہ شبہ ہوتا ہی کہ بعض عقلین غیر سلیم بھی ہوتی ہیں اور جب سلیم کے معنی تندرست کے قرار دئے گئے ہیں تو غیر سلیم اُس عقل کو کہیں گے جو مریض اور بیمار ہو۔

تو یہ ہم ابھی تک نہیں سمجھ سکے کہ تندرست (سلیم) عقل کونسی ہی اور بیمار کونسی۔ آیا عقل کو بھی کوئی مرض لگ سکتا ہی اور اگر بالفرض لگ سکتا ہی تو اس کا علاج کیا ہی۔ اُس کے واسطے طبیب کون ہی۔ اور اُس کے مرض کی علامات کیا ہیں۔

صرف یہی استفسارات ہیں جواب باقی رہ گئے ہیں۔ اور ان ہی کے حل ہو جانے پر

اس بحث کا خاتمہ بھی ہو سکتا ہی۔ مگر آپ کو ان سوالات کا جواب سُننے سے پہلے چند مختصر امور کا ذہن نشین کر لینا ضروری ہے۔

اول یہ کہ جو کام ایسے آلات کے ذریعہ سے کیا جائے جن میں احساس اور ادراک نہ ہو تو اُس کام کا نفع نقصان اُن آلات کی طرف منسوب نہیں ہوتا۔ بلکہ اُس شخص سے تعلق رکھتا ہی جو ان آلات سے یہ کام لینے والا ہی۔ مثلاً بڑھی کے کام میں بسولہ آتا ہی اگر اُس کی دھار جھڑ جائے یا لکھنے میں کاتب کے قلم کی نوک ٹوٹ جائے تو یہ سب بڑھی اور کاتب کا نقصان سمجھا جائیگا۔ بسولہ اور قلم کے حق میں نہ کوئی نفع متصور ہی نہ نقصان۔ کیونکہ نفع نقصان کا وجود درحقیقت راحت اور تکلیف سے وابستہ ہی اور راحت و تکلیف کو وہی اشیاء محسوس کر سکتے ہیں جنہیں ادراک اور شعور ہو۔ بہرحال جب آلات کا نفع وضرر اصل فاعل کا نفع وضرر ٹھہرا تو قوی عملیہ کے کاموں میں جو کچھ نفع یا نقصان ہوگا وہ فی الواقع عقل اور روح کا ہوگا کیونکہ ادراک وشعور عقل و روح ہی کا خاصّہ ہی اور سب قوتیں اُس کے آگے بمنزلہ آلات کے ہیں جیسا کہ ہم ابھی تحقیق کر چکے ہیں۔

دوسری بات یاد رکھنے کے قابل یہ ہی کہ قوۃ عقلیہ اور قوۃ عملیہ کے مابین قدرت نے کچھ ایسا مستحکم رابطہ پیدا کیا ہی کہ ان میں ہر ایک کے آثار دوسرے تک متعدی ہوتے ہیں۔ قوۃ عقلیہ کے جو آثار قوۃ عملیہ میں ظاہر ہوتے ہیں کچھ تو وہی ہیں جنکا تعلق صفت حکومت سے ہی یعنی تمام قوی عملیہ کا بمقتضائے محکومیت عقل کے ایک اشارہ پر حرکت میں آ جانا اور بعض آثار ایسے ہیں جن میں عقل کی اس حکومت کو کچھ بھی دخل نہیں۔ جیسے غصّہ کے وقت چہرہ کا تمتمانا اور آنکھوں کا سُرخ ہو جانا۔ یا خوف کے وقت جسم کا کانپنا اور رنگ کا اُڑ جانا۔ اِن حالتوں میں جب کسی اشتعال انگیز یا ہیبت ناک چیز کا ادراک عقل کو ہوا تو فوراً بلا ارادہ اور بلا اختیار غصّہ یا خوف کے آثار جسم پر

ظاہر ہو گئے۔ درآنحالیکہ حکومت کی حیثیت میں قصد اور اختیار کا پایا جانا ضروری تھا علیٰ ہذا القیاس قوۃ عملیہ کی طرف سے بھی جو اثر عقل و روح تک پہنچتا ہی دو طرح کا ہوتا ہی۔ ایک تو وہی بلحاظ محکومیت اور آلہ بننے کے قوۃ عملیہ کے تمام منافع اور مضار کا عقل کے واسطے ثابت ہونا۔ دوسرے بعض کیفیات بدنی سے عقل و روح کا بی اختیار کلفت یا راحت اٹھانا چنانچہ میل کچیل اور بول و براز سے جو کچھ نفیس طبعوں کو کدورت یا بخار درد سر وغیرہ میں کلفت یا بدن کی صفائی کی لذّت اور عافیت میں راحت ہوتی ہی وہ سب اسی قسم میں داخل ہی۔ اب جانبین سے ان پنہانی تعلقات۔ تاثیر و تاثر اور فعل و انفعال کے سلسلہ کو دیکھکر ہم کو قطعی طور پر یہ یقین ہو گیا کہ قوت عملیہ کے بعض اعمال قوۃ علمیہ (یا عقل یا روح) کے حق میں مفید اور بعض مضر ہونگے۔ اور کوئی ایک فعل بھی قوت عملیہ کا اس نفع و ضرر سے خالی نہ ہوگا۔

پس اگر کوئی ایسا کامل آدمی جس کی روح کی صحت اور عقل کی سلامتی دلائل قویہ سے ثابت ہو چکی ہو اعمال کے حُسن و قبح کے متعلق کچھ فتویٰ نافذ کرے اور ہم اپنی قوۃ عملیہ کی کارروائی اس کے خلاف پائیں تو ہم کو اطمینان کر لینا چاہیئے کہ ہماری قوۃ عملیہ مضرت یا بالفاظ دیگر مرض میں مبتلا ہی اور اُسے تاثیر و تاثر کے قانون کے موافق جو قوۃ عملیہ اور عقل کے درمیان ابھی ثابت ہو چکا ہی یہ کہنا پڑیگا کہ قوۃ علمیہ یعنی عقل بھی اپنی اصلی حالت پر نہیں ہی بلکہ بیماری میں پھنسی ہوئی ہی۔ کیونکہ اگر عقل تندرستی کی حالت میں ہوتی اور پوری قوۃ کے ساتھ صحیح احکام نافذ کرتی تو قوۃ عملیہ جو ہر طرح سے اس کی محکوم اور زیردست ہی ہرگز اس کی عدول حکمی نہیں کر سکتی تھی۔

اس سے بھی زیادہ ضعف اور اضمحلال عقل کا اُسوقت ظاہر ہوتا ہی جبکہ وہ خود بھی کسی عمل کے فوائد یا نقصانات سے واقف ہو۔ اور شہوۃ کے غلبہ یا کسی نفع جزئی معجل سے

متاثر ہو کر اپنے اصلی حکم کے خلاف قوت عملیہ سے عملدرآمد کرا دے۔ حتی کہ عمل کی ممارست سے عقل ایسی پاگل بن جائے کہ اسی مرض کو صحت سمجھنے لگے۔ چنانچہ ہر زمانہ اور ہر قوم کے حالات کا تتبع کرنے سے یہ ظاہر ہوتا ہی کہ اس میں اکثر افراد اس قسم کے روحانی امراض میں مبتلا ہوتے ہیں۔

دور کیوں جاتے ہو۔ اپنے زمانہ ہی کا حال مشاہدہ کر لو کہ اکثر لوگ ایسی موٹی موٹی باتوں میں جن کے بھلے برے سے سب واقف ہیں۔ جان بوجھ کر خلاف عقل عملدرآمد رکھتے ہیں۔ اور خاص وہ امراض جو تپ دق کی طرح مریض کو بھی کم محسوس ہوتے ہیں۔ ان کی تشخیص تو کوئی طبیب ہی کر سکے تو کر سکے۔ پھر اکثر ارواح کا یہ حال ہی کہ بچپن سے تا حیات ان علتوں میں گرفتار رہنے کی وجہ سے صحت کی لذت سے آشنا ہی نہیں ہوتیں۔ اور کینہ حسد۔ بخل۔ تکبر۔ خود پسندی وغیرہ امراض سے قطع نظر کر کے وہ عام امراض جن کو وبائی امراض کہنا چاہیئے نہایت کثرت سے وقوع میں آتے رہتے ہیں۔

جس قوم کو چاہیئے دیکھ لیجیئے کہ شادی۔ غمی۔ اور سوائے ان کے اور معاملات میں ایسی ایسی قیود اور رسوم قبیحہ کے پابند ہیں کہ جن کے نقصانات کا دل وجان سے اقرار کیا جاتا ہی۔ اسی طرح ہر فرقہ ایک جدے ہی عقائد پر دل جمائے بیٹھا ہی۔ اگر ان سارے فرقوں میں سے کسی ایک کو بھی حق پر قرار دیں تب بھی اکثر لوگ تو باطل پر ہی نکلیں گے۔

پھر اکثر اقوام کی بعض عادتیں ایسی خلاف عقل ہیں کہ جنکی قباحت تمام اہل مذاہب کے نزدیک مسلم ہی۔ ہندوستان کے رانگھڑ گوجر اور افغانستان کے کوہستانیوں اور عرب کے بدّوؤں میں چوری قزاقی اس درجہ مروج ہوئی ہی کہ رواج کی رو سے ان کے خیال میں موجب طعن وتشنیع نہیں رہی۔ طوائف کی قوم میں زنا کی اس درجہ ترقی ہی کہ معیوب ہونے کے بجائے اس کم

اپنا ہنر سمجھنے لگیں۔ بنیوں کی بزدلی اور بخل ضرب المثل ہو گیا ہی۔ اور دوسری بعض قوموں میں شراب نوشی۔ بی پردگی اور ترک ناموس کی یہ نوبت پہنچی ہی کہ اس کے نتائج بد برابر دیکھتے ہیں مگر زبان پر نہیں لاتے۔ غرض مختصر لفظوں میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ آوہ کا آوہ بگڑا ہوا ہی جس کی اصلاح کی توقع بھی بہت کم ہو سکتی ہی۔

ایسی ابتر حالت میں جبکہ کوئی عقل بھی (اِلّا ماشاء اللہ) مرض سے خالی نہیں ہی۔ مجدد صاحبؒ نے اگر یہ فرمایا کہ نبوت کا راستہ عقل کے راستہ سے علیحدہ ہی تو ہمارے نزدیک بہت بجا فرمایا۔ کیونکہ بیمار کی طبیعت بسا اوقات ایسی اشیاء کی طرف راغب ہو جاتی ہی جو اس کے لئے مضر ہیں اور اُن چیزوں سے نفرت کرتی ہی جو فی الواقع اسکو طبعًا مرغوب ہیں۔ بخار والا اکثر کھانے سے متنفر ہو جاتا ہی۔ اور دُنبل کی کلن یا خارش کی نوچ میں انسان اپنے بدن کے تراشنے اور کھال کے نوچنے پر بے اختیار مائل ہوتا ہی۔ لیکن وہ نفرت اور یہ رغبت دونوں بے محل ہیں جس کا باعث یہ ہی مرض ہوا ہی۔

اب اگر مجدد صاحب یا اور کوئی عالم یہ حکم صادر فرما دیتے کہ مذہب مرغوبات عقل سلیم کے مجموعہ کا نام ہی (اور درحقیقت ہی بھی ایسا ہی) تو ان مریض عقلوں کیواسطے آزادی یعنی مطلق العنانی کا اچھا خاصہ بہانہ ہاتھ آجاتا اور وہ ہرگز تندرست اور بیمار عقل میں تفریق قائم نہ رکھتیں۔ جس سے دنیا میں ایک فساد عظیم برپا ہو جاتا اور ہدایت کے بجای گمراہی پھیلتی۔

بہر حال جبکہ اس امر کا باور کر لینا بالکل آسان ہو گیا کہ اکثر انسانی عقلیں مبتلاء امراض رہنے کی وجہ سے اس پر قادر نہیں ہیں کہ وہ تیقن اور اطمینان کے ساتھ تمام اخلاق و اعمال میں نیک کو بد سے اور مفید کو مضر سے تمیز دے سکیں تو ناچار اس بارے میں کسی ایسے طبیب حاذق کی طرف رجوع کرنا ضروری قرار پایا جس کی رای کبھی غلطی نہ کرتی ہو۔ جو اپنے مریضوں پر پورا پورا رحم کھانے

کے علاوہ تمام دواؤں کے خواص اور اوزان سے واقف ہو جس کو مختلف دواؤں اور غذاؤں کی تاثیرات کے باریک سے باریک فرق معلوم ہوں اور جس کی نظر موسموں کے اختلاف اور روح کی تراکیب پر کامل طور سے حاوی ہو۔

لیکن ایسا طبیب اُس حکیم علی الاطلاق کے سوا کوئی نظر نہیں آتا جس کے سہارے تمام عالم کی ہستی قائم ہی جس کی ذات ہر قسم کے عیوب اور امراض سے پاک ہی اور جس کے وجود اور کمالات کو عنقریب ایک مستقل رسالہ میں ہم روشن دلائل سے ثابت کرینگے۔

دنیا میں جس قدر ہادی آئے۔ جن مقدس بندوں نے اپنی نبوت کا سکہ بٹھلایا جتنے سچے شریعتوں کے تبلیغ کرنے والے گذرے وہ سب کے سب اُسی حکیم مطلق کے مطب کے نسخہ نویس اور تربیت یافتہ تھے۔ اُنھوں نے ہمیشہ اُسی روحانی کالج کی اسناد فضیلت لوگوں کو دکھلائیں اور اُسی حکیم برحق کے عطا کئے ہوے اعزازی تمغے اور نشانات پیش کئے تاکہ اللہ کی مخلوق ماہر طبیبوں کو اشتہاری حکیموں سے جُدا کرسکے۔ رہبر اور رہزن کے پہچاننے میں دہوکہ نہ لگے اور محافظوں کی جماعت پر لٹیروں کا اشتباہ نہ ہو۔

ہم جب نبوت کی ضرورت اور نبی کے تعین پر مبسوط بحث کرینگے اُسوقت اُن علامات کا تفصیلاً ذکر کریں گے جن سے کسی خاص شخص کی نسبت یہ دریافت ہوسکے کہ وہ خدائی مدرسہ کا اعلیٰ تعلیم یافتہ اور دنیا میں حکیم علی الاطلاق کی نیابت کا واقعی مستحق ہی۔

مگر اس موقع پر نہایت اختصار کے ساتھ صرف اتنا دکھانا چاہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کے فیوضات اخذ کرنے اور اس کے علوم و کمالات کا مظہر بننے کے واسطے انسان میں عادۃً کن شرائط کی ضرورت ہی یا بالفاظ دیگر حق تعالیٰ کے مدرسہ میں طب روحانی کا حصول کس استعداد پر موقوف ہی۔

بلاشبہ اس قسم کے عمیق مباحث میں دخل دینے کا ہمکو کچھ استحقاق نہیں ہی- اور جس وادی میں ہم قدم زن ہونے کا ارادہ رکھتے ہیں- اُس کو بآسانی قطع کر لینے کا خیال محض ہماری فکر کے خارج از حوصلہ بلند پروازی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا- لیکن اُس ناواقف مسافر کو راستہ کی مشکلات کی کیا پرواہ ہوسکتی ہی جسکی دستگیری کے واسطے ایک اعلیٰ درجہ کا مبصر اور تجربہ کار ہادی موجود ہو-

ہم پہلے بھی جن تیرۂ و تاریک راہوں کو طے کر کے اس مقام تک پہنچے ہیں اُن میں کو گذرنا آسان نہ تھا اگر قاسمی تصنیفات ہمارے لئے مشعل راہ نہ ہوتیں اور اب بھی انشاءاللہ آپ دیکھیں گے کہ اُن ہی کی روشنی میں منزل پیش آمدہ کے مہالک و خطرات کا مقابلہ کرتے ہوئے ہم اپنے مقصد اعلیٰ پر صاف جا پہنچیں گے-

وہ ذات بابرکات جس کی قوۃ قدسیہ نے شریعت صادقہ کے پیچ در پیچ اور نظری در نظری اسرار کو بھی بداہت کی حدود کے قریب لا رکھا ہی- اگرچہ وہ خود دُنیا سے اُٹھ گئے مگر اُن کی قیامت تک نہ مٹنے والی یادگاریں ہماری رہنمائی کے واسطے زندۂ جاوید ہیں-

اس میں ہرگز مبالغہ نہیں کہ اگر حضرت مولانا محمد قاسم (روحی وارواحکم فداہ) کی بیش بہا کتابوں پر میری دسترس نہ ہوتی تو میں ہرگز اس طرح کے نازک مسائل پر بیخوف و خطر قلم اُٹھانے کی جرأت نہ کر سکتا- اس لئے یہ سخت احسان فراموشی اور خیانت متصور ہوگی کہ میں کسی ایسے مضمون کو اپنی طرف منسوب کر کے جو درحقیقت حضرت مولانا مرحوم کی تصانیف سے اخذ کیا گیا ہو اپنی غیر واقعی عظمت و تفوق کا ثبوت پیش کروں- میں اس سے زیادہ اپنے کو خوش قسمت اور فائز المرام بنانے کی تمنا نہیں رکھتا کہ مولانا کے عالی مضامین میرے پیرایۂ بیان میں اس طرح ادا ہو جایا کریں کہ اُن کی تعبیر میرے مدعا کے واسطے مفید اور صحیح ہو- اور اپنے مقصود

یا پریشانی تقریر کی وجہ سے دلائل کی تقریب ناتمام نہ رہے۔ چنانچہ اسوقت بھی جس بحث کا آغاز کیا جاتا ہے اس میں میرا صرف اسی قدر تصرف ہوگا۔

یہ بحث جس کی ابتداء سے آج ہماری تحریر کی دوبارہ ابتداء ہوئی ہی فی الحقیقت نبوۃ کی بحث ہے اور ہمکو ہٹ دھرمی اور دھینگا دھینگی سے نہیں بلکہ محض حق پژوہی اور انصاف کے ساتھ یہ دکھلانا ہی کہ وہ پرعظمت وجلال مفہوم جسکے لئے نبی۔ رسول۔ پیغمبر وغیرہ الفاظ وضع کئے گئے ہیں۔ کیا خارج میں واقعی طور پر اُس کے کچھ افراد موجود ہیں یا وہ بھی منجملہ اُن شاندار تخیلات کے ایک تخیل ہی جن کو مغلوب الوہم لوگوں کے دماغ فرصت اور تنہائی میں بیٹھکر اختراع کرتے رہا کرتے ہیں۔

اس آخر احتمال کو سُنکر جس سے شان نبوۃ میں سخت ملحدانہ گستاخی ہوتی ہے ہمکو اندیشہ ہی کہ شاید کوئی جوشیلے مسلمان ہمارے ایمان میں تردد پیدا کرکے ہم پر ہی نہ بگڑ بیٹھیں اسلئے ہم ایسے صاحبوں سے بادب عرض کرتے ہیں کہ وہ بجائے اسکے کہ اپنے قابل تعریف غصہ اور جوش کو ہم مسلمان ناقلین کے حق میں صرف کریں بہتر ہو کہ اُن مطلق العنان دہریوں کی سرکوبی کے واسطے استعمال فرمائیں جنکی بزبان سے ما یھلکنا الا الدھر اور ان ھی الا حیاتنا الدنیا وغیرہ الفاظ قرآن کریم نقل کئے گئے ہیں اور جنکی ایک بڑی بھاری تعداد آج کل یورپ میں زبان قال سے اور ہندوستان وغیرہ میں زبان حال سے یہ صدائیں لگا رہی ہے کہ خدا کا وجود محض ایک فرضی وجود ہے۔ نبوۃ و رسالۃ صرع کی بیماری کے نام ہیں۔ اعجاز و کرامات اگلے زمانہ کی نظر بندیوں کے افسانے ہیں۔ اور وحی والہام کی حقیقت دیوانوں کی بڑ سے کچھ زیادہ نہیں ہی۔

یہ لوگ صرف ایک عقل کے اور وہ بھی اپنی عقل کے مشورہ کو ماننا چاہتے ہیں اور اُن کے مذہب میں جادۂ عقل سے ایک انچہ اِدھر اُدھر ہٹنا کفر و شرک یا کم از کم گناہ کبیرہ کے برابر ہے۔

ہر ایسا شخص جسکو کبھی کسی مشکل مسئلہ کے متعلق افہام و تفہیم کا موقع ملا ہوگا بشرطیکہ اُسکے بیوقوف مخاطب کے مسلّمات بھی بہت ہی تھوڑے سے ہوں اندازہ لگا سکتا ہی کہ ایک ایسے آزاد فرقہ کی بے قید شبہات سے جس کا ذکر اوپر ہوا عہدہ برآ ہونا کسقدر دشوار مرحلہ ہی اور یہ کہ ہمارے مولائے ممدوح (فداہ ابی و اُمی) نے اِن لامذہبوں کے مقابلہ میں کسدرجہ ثبات و استقلال اور معقولیت سے کام لیا ہے۔

مولانا کا اس آزاد گروہ سے صرف ایک سوال ہی وہ یہ کہ تمام مخلوقات میں نیک و بد کا تفاوت۔ بھلے بُرے کا فرق اور اعلیٰ ادنیٰ کے امتیازی مدارج جو ہماری تمھاری سب کی عقل نے قائم کر رکھے ہیں اسکا معیار اور پیمانہ عقل کے پاس کیا ہی عقل نے جمادات سے حیوانات کو کیوں اچھا بتلایا ہے اور تمام حیوانات کے اعتبار سے انسان کو کیوں سند فضیلت عطا کی ہی۔ جہالت کے مقابلہ میں وہ علم کی ہمیشہ کیوں مداح رہا کرتی ہے۔ اور ہمت و شجاعت کے کارناموں کو وہ جبن و نامردی کے برخلاف کسوجہ سے سربلند رکھنا چاہتی ہے۔ المختصر وجود کو عدم پر۔ وجودیات کو عدمیات پر ہونے کو نہ ہونے پر۔ استغنا کو احتیاج پر اور راحت کو تکلیف پر کیوں ترجیح دیتی ہی۔ وہ کونسا نمونہ اُسکے پاس ہے جسکے ساتھ مناسب و مشابہ ہونے اور نہ ہونے کی وجہ سے وہ مخلوقات میں سے ہر ایک چیز کو بھلا یا بُرا بنا دینے کا استحقاق رکھتی ہی۔

اگر تم ایک اچکن کا کپڑا کسی ہشیار درزی کو قطع کرنے اور سینے کے لئے دو یا بازار جاکر کوئی عمدہ ٹوپی اور خوبصورت جوتی خریدنے کا ارادہ کرو۔ تو بیشک، تم ان سب چیزوں کی حُسن و خوبی اور موزونیت و غیر موزونیت کو اپنی اُن آنکھوں سے دیکھ سکو گے جو قدرت کی طرف سے تمکو ایسے ہی کاموں کے لئے عنایت ہوتی ہیں لیکن اس دیکھنے کے اندر تمکو چند پیمایوں پر اِن اشیاء کے مطابق کرنیکی ضرورت ہوگی۔ مثلاً اچکن کو تم اپنے بدن پر پہنکر اور جوتی کو پاؤں میں ڈالکر اور

ٹوپی کو سر پہ رکھکر دیکھو گے۔ اگر ان میں سے کوئی چیز اپنے پیمانہ پر پوری نہ اُترے۔ بلکہ ڈھیلی یا تنگ رہے تو تم اُسکو ناموزوں سمجھکر مسترد کردو گے اور اگر اتفاق سے کوئی چیز خاطر خواہ اپنے پیمانہ پر مطابق ہو گئی تو پھر خود خیال کر سکتے ہو کہ تم کہانتک اُسکی قدردانی کے لئے تیّار ہو گے۔

ٹھیک اسی طرح عقل کے پاس بھی ہر نیک و بد کی تمیز کا کوئی پیمانہ اور بھلے بُرے کی شناخت کا کوئی معیار موجود ہونا چاہیئے کہ جس پر منطبق ہونے اور نہ ہونے سے وہ ہر ایک مخلوق کے حسن و قبح کے مراتب دریافت کر سکے۔

غالبًا ہر عقل کے جذر فطرت میں جیسا کہ ہم عنقریب ثابت کرینگے مخلوقات کے ماسوا ایک ایسی اعلیٰ ہستی کا ادراک موجود ہی جو عین وجود ہونیکی وجہ سے عدم و نیستی کا شائبہ اپنے اندر نہیں رکھتی اور اسی وجہ سے وہ ہر قسم کی احتیاجات سے بے نیاز ہی۔ وہ حیّ ہے۔ عالم ہے۔ قادر ہے۔ متکلم ہے۔ ارادہ اور اختیار رکھتا ہی۔ غرض کہ تمامی عمدہ صفات کے جامع اور ہر طرح کے عیب و قصور سے بری ہے۔

اب جس حد تک عقل اپنی رسائی اور صفائی کے موافق کسی مخلوق کو اس ایک چیز سے مناسب پاتی ہی اُسی حد تک اُس کو اعلیٰ اور افضل جانتی ہی اور جو چیز جتنا اُس سے بعید المناسبتہ ہوتی ہی وتنا ہی عقل اُسکو پستی کی جانب دھکیلتی جاتی ہے۔ مثلاً

وہ عقل کے مرتبہ شناسی کا معیار (جسکو دوسرے الفاظ میں ہم خدای عز و جل کہتے ہیں) چونکہ وجود ہی وجود ہے عدم کا اُس میں اصلاً اختلاط نہیں اسی واسطے ہماری عقل موجودات کو ہمیشہ معدومات پر ترجیح دیتی ہے۔ پھر موجودات میں بھی جس شے میں خدائی صفات کا کم و بیش ظہور دیکھتی ہے۔ اُسی حیثیت سے اُسکی تفوق کو اُن اشیاء کے مقابلہ میں تسلیم کرانے لگتی ہے۔ جن میں وہ صفات نہ پائے جاتے ہوں۔

دیکھو چونکہ ہم یہ جانتے ہیں کہ خداوند کریم زندہ ہے بیجان نہیں اور اس باب میں ہمنے دیکھا کہ آدمی اور جانور خدا تعالیٰ سے زیادہ مناسبت رکھتے ہیں مٹی۔ پانی۔ ہوا۔ آگ شجر حجر وغیرہ نہیں رکھتے تو ہمنے جان لیا کہ حیوانات کا رتبہ جمادات سے اونچا ہے۔ اسکے بعد خیال کیا کہ خداوند کریم عالم ہے جاہل نہیں اور ہر انسان باقی جانداروں سے علم و عقل میں ممتاز ہے تو ثابت ہوا کہ انسان جملہ حیوانات میں اشرف و افضل ہے۔ پھر انسان بھی علم و اخلاق اور احوال و اعمال میں متفاوت اور کم و بیش ہیں تو جو کوئی علم میں زیادہ ہو اور اخلاق مثل قدرت۔ سخاوت۔ حلم۔ عفو وغیرہ کے جو خدا تعالیٰ کے اخلاق ہیں رکھتا ہو وہ بلاشبہ اپنے اقران سے فائق شمار کیا جائیگا۔

بہرکیف جس چیز کو بھی عقل بھلا یا بُرا کہتی ہی اُسکو ابتداءً یا بالآخر اُسے ایک نمونہ اور معیار پر مطابق کر کے دیکھتی ہے۔ البتہ چونکہ باہم عقلوں میں تیزی اور صفائی اور توجہ کے اعتبار سے بے انتہا فرق ہی اسلئے اس مطابقت اور مناسبت کے معلوم کرنے میں بھی بیحد تفاوت ہونا چاہیئے۔

اب تم خیال کرو کہ دنیا کی سب چیزیں ارواح ہوں یا اجسام۔ اخلاق ہوں یا اعمال۔ معانی ہوں یا الفاظ۔ باوجودیکہ خدائے برتر سے ایک قسم کی مناسبت رکھتے ہیں۔ کیونکہ سب کی اصل وہ ہی خالق بے نیاز ہے اور سب کا وجود اُسی کے وجود کا پرتو ہی۔ لیکن پھر بھی اس مناسبت میں مخلوقات کے اندر زمین آسمان کا تفاوت ہے۔

ارواح کو بسبب اپنی لطافت کے جو قرب و مناسبت جناب باری عز اسمہٗ سے حاصل ہی وہ ہرگز اجسام کثیفہ کو نہیں اور اجسام میں بھی مثلاً آگ ہوا سے لطیف ہے اور ہوا پانی سے اور پانی مٹی سے۔ تو اسی ترتیب سے ان میں سے ہر ایک کو خدا تعالیٰ شانہ کے ساتھ

ایک طرح کا قرب و مناسبت حاصل ہوگا اور شاید اسی قرب و بعد کا اثر ہے کہ لطیف چیزوں سے باوجود اس نزاکت کے وہ کارہائے نمایاں بن پڑتے ہیں کہ کثیف سے ہرگز نہیں ہو سکتے۔ برق ایک پلک جھپکنے میں آسمان سے زمین پر آتی اور پھر آسمان پر اُڑ جاتی ہو اور اس سرعت سیر و سفر میں پہاڑ بھی اگر سامنے آجائے تو اُسکی بھی ذرہ برابر حقیقت نہیں سمجھتی۔ شعاع شمس و قمر کا یہ حال ہو کہ سرعت برق بھی اُسکے سامنے گرد ہو۔ کہاں زمین کہاں چوتھا آسمان۔ خیال کرتے ہوئے دیر لگتی ہے پر اُس کو یہانتک آتے دیر نہیں لگتی۔ علیٰ ہذا القیاس اپنی نگاہ کو دیکھو اور آوازوں کی تیز روی اور خیال و گمان کی رسائی کو سوچو۔ جتنی لطافت بڑھتی جائیگی اُسی قدر زور اور قدرت زیادہ ہوگی۔ جسکی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ لطیف چیزیں اپنے قرب و مناسبت کی بدولت خدا تعالیٰ کے فیضانِ کمالات سے وہ حصہ لیتی ہیں جو بعید المناسبۃ اشیاء کو نہیں ملسکتا۔ اور اس کی نظیر ظاہر میں بالکل اس طرح ہو کہ شمع کا نور اُسکے آس پاس کی چیزوں کو بہت زیادہ منور کرتا ہے لیکن دور کی چیزیں اُس سے اتنی روشن نہیں ہوتیں۔

پس اگر وہ اخلاق حمیدہ حق تعالیٰ شانہ کی ذات بابرکات میں موجود ہیں قلیل کثیر کسی فرد بشر کے نصیب ہو جائیں تو بیشک بہ نسبت اُن افراد کے جن میں یہ اخلاق نہیں اُس شخص کو حق تعالیٰ سے بمقدار مطابقت اخلاق کے قرب روحانی ہوگا۔ اور جو عنایات خاصہ خدائے کریم کی اُس کے حال پر مبذول ہونگی اوروں کو میسر نہ ہوسکینگی۔

آپ عنقریب بوضاحت و تفصیل یہ معلوم کرینگے کہ جیسے زمین و آسمان میں چارطرف نور آفتاب کا ظہور ہو۔ اور اسی کے ذریعہ سے آپ سرخ و سفید کا امتیاز اور خوبصورت و بدصورت کا فرق قائم کرتے ہیں اور ہر صحن ہر روشندان ہر جگہ اور ہر مکان میں جُدی جُدی قطع سے وہ ہی جلوہ گری

کئے ہوئے ہے۔ ایسے ہی تمام کائنات کا وجود خداوند حقیقی کے نور وجود کی پرتوہ افشانی کا نتیجہ ہے۔ تو جس طرح آفتاب عالمتاب کو بااین ہمہ عموم فیض۔ قلعی دار آئینہ اور آتشی شیشے کے ساتھ وہ خصوصیت خاصہ حاصل ہے کہ دوسرے اجسام کے ساتھ نہیں۔

(دیکھو- آتشی شیشے میں سوائے روشنی کے آفتاب کی جانب سے ایک خاص حرارت اور آتشی اثر کی بھی آمد ہے اور باقی اجسام کو جو وہیں اُس کے پاس ہی رکھے ہوں اس تاثیر کی مطلق خبر نہیں۔ یا آئینہ قلعی دار میں آفتاب کی روشنی کا اسقدر اظہار ہے کہ درصورتیکہ دوسرے اجسام آفتاب سے فیضیاب ہو کر خود ہی روشن ہو جاتے ہیں یہ خود بھی سورج کی طرح چمک اُٹھتا ہے اور جو اجسام اِس کے بالمقابل ہوں اُن پر بھی اپنا پرتوہ ڈالتا ہے۔)

اِسی طرح فیض خداوندی کو بھی عام و خاص سمجھنا چاہیئے کہ یہ فرق بجز فرق مناسبت اور فرق قابلیت کے اور کیا ہوگا۔ ورنہ ظاہر ہے کہ جیسے آفتاب کو آئینہ یا پتھر سب برابر و یکساں ہیں ایسے ہی خدائے بے نیاز کو بھی تمام مخلوقات برابر ہیں کسی سے بخل نہیں۔ البتہ مخلوقات کی قابلیت اور مناسبت بے انتہا مختلف ہے۔

تو جو لوگ صاف باطن ہیں اور اپنے بنی نوع سے ایسے ممتاز ہیں جیسے آئینہ لوہے سے یعنی جیسے آئینہ دراصل وہ ہی لوہا ہے جو میل کچیل کے دور ہو جانے کے باعث صاف و شفاف آئینہ بنگیا ہے۔ ایسے ہی وہ لوگ بھی مثل اور بنی آدم کے وہ ہی حقیقت اور روح انسانی رکھتے ہیں۔ مگر اتنا فرق ہے کہ اُن کی ارواح بوجہ نہونے آلائیشوں اور کدورتوں کے جو بسبب تعلقات پنہانی کے ہوتی ہیں پاک و صاف ہیں وہ لوگ عجب نہیں کہ بہ نسبت اپنے بنی نوع کے زیادہ معزز و ممتاز ہوں اور بعضے ایسے فیض اُن کو خدا کی طرف سے پہنچتے ہوں کہ ہم کو تم کو اُن کی اطلاع بھی نہ ہو۔ یعنی ہم تم بذات خود اُن فیوضات سے

محروم رہیں۔ گو اُن ہی پاکدل لوگوں کے واسطہ سے جن کے قلوب پر اوّل وہ فیض وارد ہوتے ہیں صرف اِسقدر بہرہ یاب ہوجائیں جسقدر در و دیوار آئینہ منور سے یا سیاہ و سبز وغیرہ اشیاء جو جلنے کے قابل ہوں آتشی شیشے سے۔

غرض ہوسکتا ہو کہ جیسے آفتاب کے مقابلہ کے وقت آتشی شیشہ یا آئینہ قلعی دار کے باطن میں آفتاب کی طرف سے ایک فیض ایسی طرح آتا ہے کہ بظاہر آتا ہوا کچھ معلوم نہیں ہوتا اور پھر اُس کے حاصل ہوجانے کے بعد وہ دونوں بھی بقدر طاقت اپنی فیض رسانی میں مطلق بخل و دریغ روا نہیں رکھتے بلکہ ہر اُس چیز کو جو اُن کے سامنے آتی ہے اپنے حلقۂ اثر میں داخل کرنے کے واسطے تیّار رہتے ہیں۔

ایسے ہی کیا عجب ہے کہ بعض بنی آدم کے دلوں پر جن کے دل جسمانی کثافتوں اور نفسانی کدورتوں سے پاک و صاف ہیں ایسی حرارت محبّت خداوندی نازل ہوتی ہو کہ اوروں کو اس کی خبر بھی نہ ہو اور وہ خود آتشی شیشے کی مانند اُس کو پی جائیں اور تحمل کر جائیں لیکن دوسروں کے دلوں میں آگ لگا کر اور اُن کی ساری کدورتوں کو سوخت کر کے ایسا پاک و صاف کردیں جیسا لوہے کو جلا کر صاف و شفاف آئینہ بنا لیا جاتا ہو - اور پھر اُس نور الٰہی سے جو مثل آئینہ کے خاص اُن کے دلوں پر اُترتا ہے اور اُترتا ہوا معلوم نہیں ہوتا اوروں کا ظاہر مثل در و دیوار کے اور باطن مثل اُس آئینہ کے جو خود آفتاب کے مقابل نہ ہو مگر اُس آئینہ کے مقابل ہو جو آفتاب کے مقابل ہو بکمال آب و تاب جگمگا اُٹھے۔ یعنی اُن کا فیض اُن لوگوں کو جو اُن کی طرف صدق دل سے متوجہ ہوتے ہیں ظاہر و باطن میں ایسا مالامال کردے کہ کدورت کا نام و نشان باقی نہ رکھے اور عمدہ اعمال اور برگزیدہ اخلاق سے اُن کا اندرون و بیرون بخوبی آراستہ ہوجائے۔

ہماری خواہش اسوقت اپنے دوستوں سے اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ خدائی عزوجل میں (جو کہ مخزن کمالات ہے) اور چند انسانوں میں فقط ایک ایسے ہی خاص طرح کے تعلق کو مستبعد نہ سمجھیں جیسا کہ انہوں نے آتشی شیشے وغیرہ کا آفتاب کے ساتھ مشاہدہ کیا ہے۔

اگر ان کو خالق و مخلوق کے درمیان اس قسم کے پوشیدہ تعلقات کے ممکن التسلیم ہونے میں تامل نہ رہا (اور غالباً نہ رہا ہوگا) تو پھر ہم بہت ہی تھوڑے سے غور و فکر کے بعد ان خصوصیات کو طے کر سکیں گے جن سے کسی ایک یا چند معین اشخاص کی صداقت پر جو کبھی اس تعلق کے مدعی رہے ہوں کافی استدلال ہو سکتا ہو۔ لیکن۔

ہم ابھی تک تو اسی ورطۂ حیرت میں پڑے ہوئے ہیں کہ مثلاً دوپہر کا وقت ہے آفتاب ٹھیک نصف النہار پر ہے۔ کنکریاں۔ سنگریزے۔ درخت کی شاخیں۔ زمین کے ریت۔ سمندر کا پانی اور لوہے کے کالے کالے ٹکڑے غرض دنیا کی سیکڑوں ہزاروں چیزیں اس کے سامنے پڑی ہوئی ہیں۔ سورج کی روشنی میں ہر ایک شے ان میں سے الگ الگ دکھائی دیتی ہے۔ اور ہر ایک میں دھوپ کی کچھ نہ کچھ گرمی بھی محسوس ہو رہی ہے۔ لیکن ان ہی مختلف الانواع اشیاء کے بیچ میں اور ان ہی کالے سیاہ آہن پاروں کے قریب ایک شخص بیٹھا ہے جس کے ایک ہاتھ میں آتشی شیشہ اور دوسرے میں کوئی سیاہ یا سبز چادر ہے۔ اور جب وہ اپنے شیشے کو سورج کے روبرو کر کے چادر کو اس کے مقابلہ پر لاتا ہے تو اسی وقت چادر میں آگ سلگ کر دھواں اٹھنے لگتا ہے۔ اور جب شیشے کو سورج کے یا چادر کو شیشے کے سامنے سے سرکا دیتا ہے تو وہ تاثیر آتشیں باقی نہیں رہتی۔

یہ سارا تعجب انگیز ماجرا جب ہم ایک انتہا سے انتہا جاہل اور متعصب آدمی سے

کرتے ہیں تو وہ بغیر کسی استعجاب کے اُس کو تسلیم کرنے لگتا ہے۔ لیکن باوجود اِس کے وہ بہت افسوسناک بیباکی کے ساتھ محال سمجھکر تمسخر اُڑانے کو جائز رکھتا ہے۔ جب ہم اُس سے یہ کہتے ہیں کہ ایک خشک اور بی آب وگیاہ ریگستان میں جہاں پر بہت سے ایسے مختلف المذاہب مختلف الطبائع اور مختلف الالوان لوگ جمع تھے جن کے پتھریلے معبودوں کی مانند سخت وسیاہ دلوں پر آفتاب کمالات کی شعاعیں بھی اپنا گہرا اثر نہ ڈالتی تھیں۔ جن کے تہ بر تہ مادّی کثافتوں کے نیچے اُن کی لطیف روحانیت نے اپنے کو چھپا رکھا تھا۔ اور جن کی جہالت آمیز حرکتوں اور غافلانہ بدمستیوں سے دنیا کی اخلاقی مرقع کی اصلی صورت ایسی بگڑ گئی تھی کہ پہچانی نہ جاسکتی تھی۔

وہاں پر ایک ایسا صفاکیش اور روشن ضمیر انسان ظاہر ہوا جس کے قلب میں فطری طور پر کمالات الٰہی سے استفادہ کرنے کی پوری استعداد ودیعت کی گئی تھی۔ اور جس نے ہوش سنبھالتے ہی بغیر کسی ظاہری معلم کے تمام گرد و پیش کے خیالات سے علیحدہ ہو کر ایسی روش اختیار کی جو سیدھے معبود حقیقی تک پہنچانیوالی تھی۔ اِس پاکیزہ سرشت انسان کو اپنے جبلی اخلاق اور برگزیدہ ملکات کی بدولت جو وہ بطن مادر سے اپنے ساتھ لایا تھا اُس منبع الکمالات خالق سے ایک خاص الخاص نزدیکی اور مناسبت قائم ہو گئی اور جس وقت وہ خدا کا پاک طینت بندہ تمام فانی تعلقات کو فراموش کئے ہوئے دل سے طلب صادق کے ساتھ خدائے ذوالجلال کی جناب میں متوجہ ہو کر بیٹھا تو نہ معلوم کس غیر محسوس راستے سے ایک ایسی گرم روشنی اُس کے قلب کی تہ میں اُتری کہ پھر جو دل بھی سامنے آیا اُس کی ساری کدورتوں اور آلائشوں کو جلا کر کُندن بنادیا۔

کیا کوئی عقل وانصاف کا حامی اِن دونوں واقعوں میں جو ہمنے ذکر کئے مادیت اور

روحانیت کے فرق کے سوا اور کوئی فرق ہمکو ایسا بتلا سکتا ہے۔ جس سے ایک واقعہ تو ہماری احمق مخاطب کے نزدیک قابل تسلیم ٹھیرا اور دوسرے کی محال اور ناممکن سمجھکر ہنسی اُڑائی گئی۔ بلا شبہ آتشی شیشے اور آفتاب کی مثال ایک جسمانی مثال ہے جس کو ہم کسی روحانی مسئلہ کے استدلال میں بقاعدۂ منطق پیش نہیں کر سکتے۔ لیکن آپ اطمینان رکھیں کہ نہ ہم نے اس کو اپنا استدلال بنانا چاہا ہے اور نہ فی الحقیقت ہم کو بنانے کی ضرورت ہے۔

ہم اوائل تحریر میں یہ بتلا چکے کہ ہماری غرض اصلی اس موقع پر صرف اسقدر ہے کہ آپ خدائے بزرگ اور اُس کے بندوں کے مابین ایک ایسے مخصوص تعلق کے ممکن ہونے سے انکار نہ فرمائیں جس کے ساتھ حضرت رب العزت کے بعض افادات خاصہ وابستہ ہوں۔ پس اگر آپ اس قسم کے تعلق کو ناممکن اور محال سمجھیں گے تو درحقیقت مدعی آپ ہونگے اور استدلال و برہان سے کسی بات کا ثابت کرنا بھی بحیثیت مدعی ہونے کے آپ ہی کا منصب ہوگا۔ کیونکہ یہ بدیہی قاعدہ ہے کہ اگر کسی چیز کے وجود و عدم (ہونے نہ ہونے) کے متعلق نزاع ہو تو اُس میں مدعی وجود کا ماننے والا سمجھا جاتا ہے اور بخلاف اس کے اگر گفتگو کسی چیز کے امکان و امتناع (ہو سکنے اور نہ ہو سکنے) میں ہے تو اب مدعی وہ شخص ہے جو اُس کو ناممکن اور ممتنع سمجھے۔

اس اعتبار سے اگر میں بغیر کسی مزید توضیح کے یہ کہدیتا کہ بعض بنی آدم اور خدائے عزوجل میں بعض ایسے تعلقات ممکن ہیں جو اُس کے اور بنی نوع میں نہ پائے جاتے ہوں تو مجھسے کسی قسم کے مطالبۂ دلیل کا استحقاق نہ تھا۔ بلکہ مجھکو حق تھا کہ میں اپنے اُن مخالفوں سے جو ایسے تعلقات کو محال کہتے ہوں حجۃ طلب کروں۔ لیکن میں نے مناظرہ کے پہلو سے درگذر کر کے محض تقریب الی الفہم اور تسکین خاطر اور رفع اضطراب

کے لئے ایک محسوس و مشاہد نظیر بھی اپنے مدعا کی تبرعًا پیش کر دی تاکہ جو لوگ مادیات و محسوسات کے دائرہ سے ایک قدم باہر نکالنے کے خوگر نہیں ہیں وہ بھی ان غیر محسوس تعلقات کی نوعیت سے فی الجملہ واقفیت حاصل کر سکیں۔

یہ ایک اتفاقی اور بہت ہی فائدہ مند بات ہوئی کہ جب ہم خالق و مخلوق کے ان پنہانی تعلقات پر بحث کر رہے تھے اور نظیروں اور مثالوں کے ذریعہ سے اُن کو دلنشین کرتے جاتے تھے تو اُس کے ضمن میں ہم کو چند ایسے اصول و اسباب کے سُراغ لگانیکا بھی موقع مل گیا جن پر یہ تعلقات واقع میں متفرع ہوتے ہیں۔ کیونکہ ہمنے یہ جان لیا کہ ان تعلقات خاصہ کی بنا اُس قرب و مناسبت پر ہے جو کسی انسان کو خدا تعالیٰ سے اپنی روحی لطافت میں کامل اور اخلاق حمیدہ سے متصف ہونیکی وجہ سے حاصل ہوتی ہے۔ اور اس لئے ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ جو شخص ان اعلیٰ اوصاف کے ساتھ موصوف راستی کا حامی اور کمینہ اخلاق و ذمائم سے محترز ہو گا اُس کو بعید نہیں کہ بسبب قرب روحانی کے خدائے عزوجل کی جانب سے اندرونی طور پر اس قسم کے افاضات خاصہ ہوتے ہوں جو اُس کے دوسرے بنی نوع کو نہ ہوں۔ اور وہ اُن اسرار الٰہی پر مطلع ہوتا ہو جن کے دریافت کرنے سے اور لوگ عاجز رہ گئے ہوں۔ خدائے اقدس نے اپنے کمالات کا اُسکو آئینہ بنا لیا ہو۔ اور اسی شان مرآتیتہ کی وجہ سے اُس کے دل میں خدا تعالیٰ کے نہایت غامض اور دقیق مافی الضمیر بھی منعکس ہو جاتے ہوں۔

اگر فرض کرو کہ ہمکو دنیا میں کسی معتبر ذریعہ سے ایسے ایک یا چند آدمیوں کے وجود کا پتہ لگ گیا جن میں یہ صفات اعلیٰ اور اکمل حیثیت کے اندر پائے جائیں تو یقیناً یہی لوگ ہماری اُن بیمار عقلوں کے درد کا درماں بن سکیں گے جن کے مرض کا مفصل

تذکرہ ہم صفحہ ۴۶ میں کر چکے ہیں اور جن کی نسبت ہمنے کہا تھا کہ وہ مبتلائے امراض رہنے کی وجہ سے اپنے نیک و بد اور نافع و مضر میں اُسی طرح صحیح تفریق نہیں کر سکتے جس طرح ایک بیمار آدمی بخار کی وجہ سے عمدہ عمدہ کھانوں کو بُرا سمجھنے لگتا ہی جو اُس کو طبعًا مرغوب ہیں اور دُنبل کی گُلکَن یا خارش کی نوچ میں اپنے بدن کے تراشنے اور کھال کے نوچنے پر بے اختیار مائل ہو جاتا ہے۔ حالانکہ وہ حالت صحت میں اس حرکت کو ہرگز عزیز نہیں رکھتا تھا۔

یہ اُس خدائے بے نیاز کا بہت بڑا احسان ہی کہ میں نے جس مقصد کے ثابت کرنے کے واسطے چلنا شروع کیا تھا یہاں پہنچکر میں نے اُس کو پالیا۔ اور حضرت مولانا محمدؐ قاسم رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر کے آغاز سے انجام تک حسب ذیل نتائج برآمد ہوے۔

(۱) افعال انسانی میں نیک و بد کی تقسیم ہر فرد بشر کو خواہ وہ کوئی مذہبی آدمی ہو یا دہری ماننا ضروری ہے۔

(۲) عقل سلیم جس کام کو اچھا یا بُرا بتلاے وہ ویسا ہی ہوتا ہے اور شریعت کے احکام بھی عقل سلیم کے مطابق ہوتے ہیں۔

(۳) عقل اور قوۃ عملیہ میں ایسا رابطۂ خاص ہی کہ اُن میں سے ہر ایک کا اثر دوسرے تک پہنچتا ہے اور حرکات ناشایستہ اور افعال ذمیمہ کا کسی شخص سے سرزد ہونا اسکی دلیل ہی کہ اُس کی قوۃ علمیہ (عقل) مریض یا کمزور ہے۔

(۴) عقل سقیم (مریض) جس شے کو نافع یا مضر بتلاے اُس پر اطمینان نہیں ہو سکتا اس بارہ میں عقل سلیم درکار ہے۔

(۵) ہر ایک چیز کے حسن و قبح سے کماحقہٗ خدا تعالیٰ ہی واقف ہو سکتا ہی۔ یا وہ

شخص جس کو خدا تعالیٰ محض اپنے فضل و عنایت سے جس حد تلک واقف کردے۔

(٦) خدا تعالیٰ کے فیوض و عنایات خاصہ سے ہر ایک انسان بقدر اپنے قرب و مناسبت کے مستفید ہوتا ہے۔

(٧) جسقدر کوئی عقل لطیف یعنی نفسانی آلایشوں اور مادی کثافتوں سے پاک و صاف ہوکر اعلیٰ سے اعلیٰ اخلاق کے ساتھ مزین ہوگی اُسی قدر اُسکو خدائے عز و جل سے قرب و تعلق حاصل ہوگا۔ اور ایسی ہی عقلوں کو ہم عقول سلیمہ کے نام سے یاد کرنے کے مستحق ہونگے۔

اِن صاف و صریح مگر مہتم بالشان نتائج کے سمجھ لینے کے بعد صرف یہ ہی نفع نہیں ہوا کہ ہم اپنے ایک خاص مقصد میں بقدر ضرورت کامیاب ہوگئے بلکہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر پر جو کچھ نکتہ چینیاں پہلے کی گئیں تھیں اُن میں سے اکثر کا جواب بھی ضمناً اسی بیان سے نکل آیا۔ چنانچہ جن ناظرین کو امام ممدوح کی تقریر اور اُسکے متعلق شبہات یاد ہونگے وہ خود ہماری پوری تقریر پر مکرر نظر ڈالکر اُمید ہے کہ ہر ایک شُبہ کا جواب دریافت کرلینگے۔

البتہ سرسیّد کے اُس اعتراض کا کوئی جواب ہمارے مضمون میں ابھی تک نہیں آیا کہ جب عموماً لوگوں کی عقلیں مبتلائے امراض رہنے کی وجہ سے صحیح و فاسد اور نیک و بد میں تمیز نہیں کرسکتیں اور نہ وہ ہر ایک بھلے بُرے کے پہچاننے کے واسطے کافی ہیں تو ہمکو خدا تعالیٰ کی جانب سے احکام شرعیہ کا مکلف بنانا کیونکر صحیح ہوا حالانکہ انسان اپنے ذی عقل ہونے ہی کیوجہ سے تمام حیوانات کے برخلاف شرعیات کا مخاطب قرار دیا گیا ہی۔

اِس کا جواب مختصراً تو صرف اتنا ہی ہی کہ شریعت نے جن چیزوں کے سمجھنے یا کرنیکی جس حد تک تکلیف دِی ہے اُن میں سے کوئی چیز بھی ہمارے حیطۂ قدرت سے خارج نہیں ہے اور

ہمارے ذی عقل ہونے اور اپنے ابناء جنس سے ممتاز بننے کا یہ نفع کافی ہی کہ ہم خدا کی خدائی اور رسول کی رسالت پر مطلع ہو کر اپنے جملہ ارادات اور حرکات و سکنات کی باگ اُن دونوں کے ہاتھ میں دیدیں۔ اور اجمالاً یہ جان لیں کہ جن دونوں کی صداقت کا ہمکو یقین ہوچکا ہی وہ بلاشبہ ہمارے کامل خیرخواہ اور کامل حکمت والے ہیں۔ اور اُن کی ہر ایک چھوٹی سی چھوٹی تعلیم پر کاربند ہونا ہمارے لئے فلاح و سودمندی سے خالی نہیں ہے۔ اگرچہ ہم اُن کل احکام کی یا اُن میں سے بعض کی تفصیلی حکمتوں اور مصالح پر مطلع نہ ہو سکے ہوں۔

اور یہ بالکل ایسا ہی ہی کہ ایک ماہر ڈاکٹر جب کسی دوا یا غذا کے متعلق مفید یا مضر ہونیکا فتویٰ دیتا ہے تو ہم خواہ اُس چیز کے خواص و کیفیات بلکہ نام سے بھی صحیح طور پر آشنا نہ ہوں اور خواہ جس کے استعمال کا وہ حکم دیتا ہے اُس سے نفرت اور جس سے وہ منع کرتا ہے اُس کی طرف رغبت بھی ہو مگر ڈاکٹر کی تجربہ کاری اور بہی خواہی پر اعتماد کر کے جس کو ہم نے محض ایک کمزور اور ضعیف گمان کے ساتھ تسلیم کر رکھا ہے۔ ہم اُس دوا یا غذا کے استعمال کی نسبت اپنا سابق رویہ بدل ڈالتے ہیں اور اس تبدیلی کے وقت بیچاری عقل کی ایک بھی نہیں سُنتے بلکہ یوں تاویل کر کے تسلّی کر لیتے ہیں کہ عاقلوں کی پیروی بھی درحقیقت عقل کی ہی پیروی ہے تو اس حیثیت سے گویا ہمنے عقل کے اشارہ کے بغیر کوئی جنبش نہیں کی۔

یہ ہی حال بعینہ مذہب و شریعت کا ہے۔ لیکن ہم کو تعجب کے ساتھ افسوس ہوتا ہے کہ سرسیّد نے ایک نرالی منطق سے اور عجیب گول مول الفاظ میں لوگوں کے دلوں سے ہمارے اس صحیح خیال کو مٹانا یا کم از کم سُست کر دینا چاہا ہے جس جگہ وہ یہ لکھتے ہیں کہ:

> ”ہمارا یہ اُصول نہایت جنچا ہوا ہے کہ انسان صرف بسبب عقل کے جو اُس میں ہی مکلّف ہوا ہے پس جس بات پر وہ مکلّف ہوگا ضرور ہے کہ فہم انسانی سے خارج نہ ہو ورنہ معلول کا وجود بغیر علّت کے لازم آتا ہے۔ جو محال و ممتنع ہے۔ پس جن اخلاق کے پکڑنے اور چھوڑنے پر انسان مکلّف ہے وہ ضرور عقل انسانی سے خارج نہیں۔“

(تہذیب الاخلاق جلد دوم مطبوعہ لاہور مضمون کانشنس ص ۱۲۳)

میرا سوال سر سید سے یہ ہی کہ جس عقل کو وہ تکلیف شرعی کے واسطے علت قرار دیتے ہیں اُس سے کیا مراد ہے۔ آیا فقط قوۃ ادراک کا انسان میں موجود ہونا یا اُس سے ہر ہر چیز کو تفصیلاً جاننا۔ اگر پہلی صورت اختیار کی جائے تو بعض احکام و اخلاق کے فوائد و علل پر مطلع نہ ہونے سے علّت و معلول میں جدائی کس طرح لازم آئی اور اگر خدانخواستہ سر سید نے دوسری شق کو لیا ہے تو میں تسلیم نہیں کرتا کہ جو علت تکلیف کی سر سید نے قرار دی ہے وہ صحیح ہی اور آپ حیرت کرینگے جب یہ سُنیں گے کہ جیسا کہ میں اس شق کو تسلیم نہیں کرتا خود سر سیّد بھی اُس کے اعتراف کرنے پر تیار نہیں ہیں۔ چنانچہ اُسی مضمون کے دوسرے حصّہ میں وہ لکھتے ہیں۔

> ”اس بیان سے جو ظاہرا بالکل سیدھا اور صاف ہی اور کج اور پیچ اُس میں کچھ نہیں ہی اتنی بات ثابت ہوتی ہی کہ کانشنس فی نفسہ کوئی چیز نہیں ہی اور نہ وہ ابتداءً کسی مذہب کا اصل اصول قرار پانے کے لائق ہی اور نہ وہ فی حد ذاتہ رہنما ہونے کے مستحق ہی۔ ہاں بلا شبہ سچّے اصول پر انسان کی طبیعت تربیت پا جاوے یا سچّے خیالات سے اُس کی طبیعت موثر ہو جاوے اور طبیعت سچائی کے مطابق حالت پیدا

کرلے تب وہ حالت طبیعت یعنی کانشنس انسان کا رہنما ہوتا ہے۔"

(ایضاً تہذیب الاخلاق صف ۱۳۰)

دوسری جگہہ لکھتے ہیں:۔

"ہاں یہ سچ ہی کہ قانون قدرت پر غور اور فکر کرنے سے وہ صحیح اخلاق جو انسان کی طبیعت کو ایسی حالت پر کردیں جو کبھی دھوکہ نہ دے دریافت کرسکتے ہیں مگر کب۔ جبکہ انسان کی معلومات کو ایک کافی ترقی اور قوانین قدرت پر اور اُن مختلف قویٰ کے اوپر جو اُس کے بانی نے انسان میں رکھے ہیں ایک معتدبہ آگاہی حاصل ہو۔ تمام انسان اُن دقائق پر نہیں پہنچ سکتے اور جو پہنچ سکتے ہیں وہ معدودے چند کے سوا نہیں ہوسکتے اور وہ بھی نہ اپنی عمر میں بلکہ پشتوں در پشتوں اور صدیوں در صدیوں میں پس اسلئے تاکہ اُس قادر مطلق کی حکمت بیکار نہ رہے ضرور ہوا ہے کہ وقتاً فوقتاً ملک اور زمانہ کی حالت کے لحاظ سے ایسے ہادی پیدا کئے جائیں جنمیں خلقی ایسا مادہ دیا گیا ہو اور جو باعتبار اپنی فطرت کے اُن سچے اخلاق کے بیان کا مخزن ہو۔"

(ایضاً صنف ۱۲۲)

اِن دونوں عبارتوں سے بھی اور اُن کے اور بعض تصریحات سے بھی یہ ثابت ہوگیا کہ جملہ احکام شرعیہ کے لم اور علّت کو سمجھ لینا گو مطلق عقل انسانی سے خارج نہیں ہی لیکن ہر عقل شخصی کا یہ منصب بھی نہیں کہ ہر ایک حکم کی حقیقت اور کنہ کے سمجھ لینے کا وہ دعویٰ کر بیٹھے۔ تو سر سیّد کے اصول کے موافق سوال یہ ہے کہ سوائے اُن معدودے چند انسانوں کے جو دقائق شریعت سے خبردار ہوں (جیسا کہ سر سید بزعم خود تھے) اور لوگوں کو جو ایسے نہیں ہیں مکلف بنانا کیونکر صحیح ہوا۔ حالانکہ جن باتوں کے کرنے یا چھوڑنے پر اُن کو برانگیختہ کیا جاتا ہی وہ اُن کی عقل شخصی سے یقیناً خارج ہین۔

پس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا کہ ہم گرفتاران ہوا و ہوس اور مریضان عقل و ادراک اُن ارباب عقول سلیمہ کو جن کے کچھ کچھ اوصاف ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں اطبا روحانی سمجھ کر اپنے لئے کم از کم اسی طرح موت دائمی اور ہلاکت ابدی سے نجات دلانے والا تصور کر لیں جیسا کہ ایک جاہل بیمار جو بغرض تداوی کسی طبیب حاذق کے آستانہ پر حاضر ہو کر اُسکی نسبت خیال رکھتا ہی۔ اور جس طرح ایک دیہاتی مریض اپنے معالج ڈاکٹر کے کہنے سے فقط اس اعتماد پر کہ وہ اُس کے خواص اور منافع و مضار سے کما حقہ آگاہ ہوگا کونین کے (بلکہ کسی نامعلوم الاسم دوا کے) کھانے کے لئے بلا پس و پیش آمادہ ہو جاتا ہی (حالانکہ ذاتی طور پر وہ اُس سے کچھ بھی واقفیت نہیں رکھتا) ٹھیک اسی طرح ارباب عقول سقیمہ کو لازم ہی کہ وہ ارباب عقول سلیمہ کے احکام کے سامنے بالکل گردن ڈالدیں اور اُن نسخہ جات کے استعمال کرنے اور پرہیز کے قایم رکھنے میں جن کا ارباب عقول سلیمہ نے امر فرمایا ہو ایک لمحہ کیلئے بھی توقف۔ تردد اور تنگدلی کو دخل نہ دیں بشرطیکہ طبیب کے طبیب اور اُن نسخہ جات کے بامر طبیب ہونے میں اُنکو کوئی شُبہ باقی نہ رہ گیا ہو

فلا و ربک لا یومنون حتی
یحکموک فیما شجر بینهم ثم لا
یجدوا فی انفسهم حرجا مما
قضیت و یسلموا تسلیما۔

پس قسم ہے تیری پروردگار کی کہ یہ لوگ ایمان سے
ہرگز بہرہ یاب نہیں ہو سکتے تاوقتیکہ تمکو (اے پیغمبر) اپنے
باہمی منازعات میں حکم نہ ٹھہرا دیں۔ اور پھر تمہارے فیصلہ کے
سامنے بغیر کسی قسم کی دل تنگی کے گردن تسلیم نہ خم کر دیں۔

ممکن ہی کہ یہ سوال اُٹھایا جاوے کہ جب ارباب عقول سقیمہ کو محض اپنے عقلوں پر اعتماد کرنا اور اُن کی ہدایات اور احکام پر چلنا ہی روا نہیں رہا اور نہ کسی شرعی معاملہ میں اُن کے اقتضاآت عقلیہ کی توثیق و تصویب ضرور قرار دیگئے تو آخر اسکے باور کر لینے کی ہی

ہمارے پاس کیا ضمانت ہے کہ عقل سلیم و سقیم کے امتیاز اور طبیب و مریض کی تشخیص اور معالج و مستعلج کی جستجو میں وہ ہی مریض عقلیں صحت و استقامت کے ساتھ ضرور کامیاب ہو جائیں گی اور اس کا احتمال باقی نہ رہیگا کہ جس شخص کو اُنھوں نے تندرست شمار کیا ہو وہ فی الحقیقت بیمار ہو۔ اور جس کو اپنا نجات دہندہ طبیب سمجھے ہیں وہ ایک نا اہل اور خطرہ جان ہلاکو ہو۔

لیکن ایسا سوال پیش کرنے والوں کو تھوڑی دیر کے واسطے اس پر غور کرنا چاہئے کہ اگر کسی اجنبی بستی میں کوئی اجنبی طبیب آجائے اور وہاں کے لوگوں سے اپنے فن کی حیثیت میں تعارف پیدا کرانا چاہے (حالانکہ وہ لوگ نہ تو نظریات طب سے خبردار ہیں اور نہ انواع مرض سے واقفیت رکھتے ہیں اور نہ اُن کے لئے طرق علاج کی صحت و غلطی کا دریافت کرنا آسان کام ہو۔) تو ایسی صورت میں اُس طبیب کو اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کے لئے کیا تدابیر اختیار کرنا پڑتی ہیں۔

یہ کھلی ہوئی بات ہی کہ سب سے پہلے تو وہ مجامع و مجالس میں موقع بموقع اپنے طب دانی کا تذکرہ کریگا۔ اپنے مطب پر ایک بڑا سا سائین بورڈ لگائے گا۔ اور وقتاً فوقتاً اپنے اسانید کو جو کسی معتبر مدرسہ سے اس کو دستیاب ہوئے ہونگے خواص کے روبرو پیش کرتا رہیگا اور اُس کے بعد کچھ لوگ تو عام چرچا سُنکر اور محض شہرت پر ایمان لاکر اور کچھ محض امتحان اور جانچ کرنے کی نیت سے اور کچھ طبیبوں کے احوال و اطوار سے قدرے واقفیت رکھنے کی وجہ سے اُس کے پاس بغرض معالجہ آنے لگیں گے۔ اور بہت سے مریضوں کے پاس اپنا اعتبار بڑھانے اور مطب کو چمکانے کے لئے وہ بذات خود بغیر کسی قسم کی فیس اور مالی معاوضہ کے دور دراز کے تعلقات جتلا کر چلا جائیگا۔

اب اس ساری جد و جہد اور دوادوش میں اگر کچھ بیماروں کی شفا اُس کے ہاتھ سے مقدر ہے تو وہ اس کی اولین کامیابی کا باعث ہوگی۔ اور جوں جوں کہ یہ سلسلہ ترقی کرتا جائیگا۔ اسی قدر اس کی عزّت اور مقبولیت کو چار چاند لگتے جائیں گے۔ انتہا یہ ہے کہ وہ کچھ زمانہ کے بعد شہرت عامّہ کے اس درجہ پر پہنچ جائیگا کہ مریضوں کو اُس کے یہاں پہنچنے کے لئے استدلال اور غور فکر کی ضرورت باقی نہ رہیگی اور عوام کے محاورات میں شفا و صحت تو اس کے معالجانہ کوششوں کی طرف اور موت و ہلاکت خالی بخت و اتفاق یا مشیت ایزدی کی طرف منسوب ہونے لگیگی بلکہ اس سے بھی بڑھکر یہ کہ دوسرے نئے طبیبوں کی مقبولیت کا معیار ہی اب اُس کی تسلیم و تصدیق قرار پا جائینگے۔

بعینہ اسی پر اطبا روحانی (انبیا علیہم والصّلوٰۃ والسلام) کے حالات کو قیاس کرو۔ جب وہ عالم کی ہدایت و اصلاح کے لئے مبعوث ہوتے ہیں تو سب سے اوّل وہ اپنے مِنَ اللہ بشیر و نذیر ہونیکا نہایت زور شور اور تحدّی کے ساتھ دعویٰ کرتے ہیں۔ اور اپنی دعوت و تبلیغ کا غلغلہ اہل و عیال اور خویش و اقارب سے شروع کرکے مشارق و مغارب میں ڈالدیتے ہیں۔ جس کو سُن کر کچھ لوگ تو اُن کے سابق چالیس سالہ زہد و ریاضت پاک و صاف اخلاق۔ دیانت و راستبازی اعراض عن المال والجاہ شرافت حسب و نسب اور روشن خوارق یا آیات بینات وغیرہ امور کی وجہ سے اور بہت سے محض از راہ امتحان و تفتیش ہی فطرۃً اُن کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ اور بہت سے وہ خوش قسمت ہیں کہ خود انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام اپنی قوت قلبیہ اور ہمّت باطنی کے زور سے باذن اللہ اُن کو اپنی طرف جذب کر لیتے ہیں۔ اور اسی اثنا میں جب یہ لوگ روحانی امراض سے یکایک شفا یاب ہونے لگتے ہیں اور اُن کے دلوں کی تاریکی دور ہو کر جمال خداوندی کا عکس اُن میں پڑنے لگتا ہے تو وہ اپنے ہادی کی

نسبت فوراً چلا اُٹھتے ہیں کہ:-

ماھذا بشرا ان ھذا الا ملك كريم

اُس وقت ان مریضوں کو بھلا چنگا دیکھکر اور اُن کے حالات سابقہ میں ایسا انقلاب عظیم پاکر اوروں کے دل بھی نرمانے لگتے ہیں اور اُن کو ان کی صحت کی بحالی پر رشک آنے لگتا ہے پھر تو مخلوق خدا فوج در فوج اور جوق در جوق ہو کر اُس پاک بندے کے گرد جمع ہو جاتی ہو اور اپنے اپنے امراض کا مرافعہ اس کی طرف کرتی ہو۔ اور جیسے جیسے کہ یہ سلسلہ وسیع تر ہوتا جاتا ہے اندھوں کی آنکھیں کھلتی جاتی ہیں۔ اور غافلوں کو عبرت حاصل کرنے کا موقع ہاتھ آتا رہتا ہے اُس کے بعد اُس کے طبیب حاذق (یا نبی مرسل) سمجھنے کے واسطے نہ کسی استدلال کی ضرورت رہتی ہو اور نہ اُس میں بہت زیادہ تدقیق اور غور وخوض کو کام فرمانے کی۔

الغرض جسوقت طبیب حاذق (نبی) کی شناخت کے لئے انسان کو اپنے دماغ پر کچھ زور ڈالنے کی ضرورت تھی اُس وقت تو چند قدرتی اسباب کی بنا پر یہ شناخت بغیر زور ڈالے ہی حاصل ہو گئی اور اب جبکہ اُس کے حذاقت کے نتائج متمثل ہو کر گویا آنکھوں کے سامنے نمودار ہو گئے ہیں تو اس بحث میں کد وکاوش کی مطلقاً حاجت ہی باقی نہیں رہی۔ ہر شخص اُن محسوس ومشاہد نتائج کو دیکھکر اسی طرح اُسکے طبیب حاذق (نبی) ہونے کا یقین کر سکتا ہو جیسا کہ کسی گھر کے صحن میں دھوپ نکلی ہوئی دیکھکر آسمان پر آفتاب کے نکلنے کا۔

اور اس بدیہی بلکہ اجلی البدیہیات کے سمجھنے کے واسطے انسان میں ذرا سی عقل بھی خواہ وہ کتنی ہی علیل کیوں نہو کفایت کرتی ہے۔ بشرطیکہ وہ اس سے کام لینے کی کوشش کرے اور حق کے دیکھنے سے جو اُس کو چمٹنا چاہتا ہے بالکل آنکھیں بند نہ کرلے۔

اور جیسا کہ ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں ارباب عقول سقیمہ سے یہ مطلب ہمارا ہرگز نہیں ہے

کہ اُن میں کسی موٹی سی موٹی اور روشن سی روشن بات کے سمجھنے کی بھی قابلیت باقی نہ رہی ہو اور محسوسات کے ادراک کی استعداد بھی اُن سے سلب کر لی گئی ہو۔

تم خود خیال کرو کہ کسی تجربہ کار طبیب کے ہاتھ پر تپ کہنہ کے پانچ چار مریض (جو زندگانی سے مایوس ہو چکے ہوں) شفایاب ہو جائیں تو گھر گھر میں اُس کا چرچا پھیل جاتا ہی اور دور دراز شہروں کے مایوس العلاج بیمار اُس کی طرف رجوع کرنے لگتے ہیں اب اگر فرض کرو کہ ایک طبیب کے دست شفا سے کوئی بستی کی بستی یا ملک کا ملک تپ کہنہ سے صحت یاب ہو جاوے تو اُس کی طرف لوگوں کی توجہ کیا کسی منطقی استدلال کے محتاج رہیگی۔

مثلاً سرخیل اطباء روحانی جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم (جیساکہ ہم نے اپنے رسالہ الاسلام میں نہایت مفصل بیان کیا ہی اور یہاں پر مصلحتاً ہم اپنے زمانہ کے ایک (اصطلاحی) روشن خیال مؤلف کے الفاظ میں لکھتے ہیں) ایک ایسے زمانہ میں پیدا ہوئے جبکہ دنیا ایک عجیب روحانی سکتے کی حالت میں تھی۔ اور آپ ایسے ملک میں مبعوث ہوئے جہاں اخلاقی تعلیم کا کچھ سامان نہ تھا۔ اور ایسی قوم کی اصلاح آپ کے ذمہ کی گئی جو سوائے اوہام اور فاسد عقیدوں اور باطل خیالات اور غلط رایوں اور وحشیانہ اعمال اور بداخلاقی اور نفاق اور جنگ جوئی کے کسی قسم کی اخلاقی خوبی نہ رکھتے تھے۔ مگر آپ کے الہامی بیان اور خدائی قوت نے ان پر ایسے عجیب و غریب تاثیر کی کہ اُس سے اُن کی تمام ظاہری و باطنی حالتیں بدل گئیں۔ برسونکے بہکے ہوئے خدا کی راہ پر چل نکلے اور مدتوں کے سوتے ہوئے غفلت کی نیند سے چونک پڑے جو مشرک تھے وہ موحد ہو گئے جو کافر تھے ایمان لائے جو بت پرست تھے وہ بت شکن بنگئے جو گمراہ تھے وہ خدا کی راہ دکھانے لگے۔ جاہلانہ حمیت اور وحشیانہ عصبیت کا ان میں نام نہ رہا۔ خاندانی جھگڑے اور پشتینی عداوتیں جاتی رہیں۔ دماغ غرور و نخوت سے خالی

ہو گئے۔ اور اُن کے دل صبر و توکل۔ حلم و بردباری۔ زہد و پرہیزگاری اور جمیع اخلاقی صفات سے بھر گئے۔ آپ کی تعلیم و ہدایت نے ایک ایسا گروہ خدا پرست پاک طبیعت۔ راست باز۔ نیک دل لوگوں کا قائم کر دیا جن کی کوششوں سے شرک و بُت پرستی کی آواز جو تمام جزیرہ نمائے عرب میں گونج رہی تھی بند ہو گئی اور اُس کے بدلے ایک بیچوں و بیچگوں بے شبہ و بے نموں خدا کی منادی پھر گئی۔ بتوں نے عدم کا راستہ لیا۔ بتخانوں کا نشان مٹ گیا۔ آتشکدے ٹھنڈے پڑ گئے۔ تثلیث کا طلسم ٹوٹ گیا اوہام پرستی کا باطل خیال باطل ہو گیا۔

جاء الحق وزهق الباطل	حق ظاہر ہو گیا اور باطل مغلوب۔ بلا شبہ
ان الباطل كان زهوقا۔	باطل مغلوب ہی ہو کر رہتا ہے۔

کیا اِس سے اس امر کا مشاہدہ اور درخشاں ثبوت نہیں ملتا کہ آپ حقیقت میں سچے رسول (طبیب حاذق) اور خدا ہی کی طرف سے مؤید تھے ورنہ انسان کا کام نہ تھا کہ وہ ایسا انقلاب عظیم عرب کی روحانی اور اخلاقی حالت میں پیدا کر دیتا۔ اور ایسے جنگ جو ستم پیشہ لوگوں کو جو بات بات پر لڑتے اور جھگڑتے تھے۔ اخوۃ کے ایک رشتہ میں باندھ دیتا۔ اور اُن کی پشتینی عداوتوں اور کینوں سے اُن کے دلوں کو ایسا صاف کر دیتا کہ اُس کا کچھ اثر باقی نہ رہتا بلکہ دنیا میں اُن کو اخلاق اور انسانیت کا نمونہ بنا دیتا۔

سرور کائینات صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کی ایسی عجیب و غریب تاثیر اور ایسے حیرت انگیز نتائج کو دیکھکر منکرین بھی اس بات کے معترف ہیں کہ درحقیقت یہ بات بشری قدرت سے خارج تھی۔ چنانچہ کوئی اُن میں سے کہتا ہے کہ ”وہ پیام جو آپ لائے وہ ایک سچا اور حقیقی پیام تھا جس کا مخرج وہی ہستی تھی جس کی تہاہ کبھی کسی نے نہیں پائی“۔ کوئی لکھتا ہے کہ:۔

”قرآن ہی کی تعلیم کا یہ اثر ہے کہ عرب کے رہنے والے ایسے بدل گئے جیسے کسی نے سحر کر دیا ہو“

متعصب سے متعصب عیسائیوں میں سے سخت سے سخت متعصب یہ اقرار کرتا ہی کہ:۔

"دین مسیحی کی ابتداء سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم" کے وقت تک کبھی حیات روحانی ایسی برانگیختہ نہیں ہوئی تھی جیسی کہ اسلام کی تعلیم سے ہوئی"۔

پھر کیا ایسے ایسے واشگاف ثبوتوں اور کھلی کھلی دلیلوں کے بعد بھی کوئی محروم البصیرۃ ایسا نکلے گا جو باوجودیکہ اپنے کو مریض سمجھتا ہو اور کسی نباض اور ماہر طبیب کی طرف رجوع کرنیکا خواہشمند بھی ہو۔ لیکن طبیب عرب (نہیں بلکہ طبیب عرب وعجم) کے ان چمکتے ہوئے کارناموں سے منہ پھیرلے۔ اور اُس کی تجویز اور تشخیص کے سامنے (جو لاریب خدا کی ہی تجویز و تشخیص ہی) بے چون وچرا اور بے ریب و تردد گردن نہ ڈالدے اور کم از کم تجربہ ہی کے طور پر اُسکے بتلائے ہوئے تدابیر و معالجات و پرہیز پر چند روز عمل کر کے نہ دیکھے۔

ایسے ہی کور باطنوں کی نسبت (جو ابھی تک اس طرح کی بدیہی صداقت کے تسلیم کیواسطے نہایت پیچیدہ اور دور از کار مسائل و دلائل کی تلاش میں فضول سرگردان رہ کر عمر عزیز ضائع کر رہے ہیں اور دن سے زیادہ روشن واقعات کی طرف آنکھ نہیں اُٹھاتے) عارف باللہ حضرت شیخ محی الدین بن العربی قدس اللہ سرہ ارشاد فرماتے ہیں کہ:۔

ہمارے نزدیک سب سے زیادہ عجیب بات یہی کہ انسان (ہر بات میں) خدا کو چھوڑ کر محض اپنی نظر و فکر کی ہی تقلید کرے حالانکہ وہ جانتا ہی کہ اُس کی یہ فکر بھی خود اُس کی ذات کی طرح ایک امر حادث اور مخلوق ہی اور اُن قوی میں سے ایک قوۃ ہے جو خدائے تعالیٰ نے انسان کے اندر ودیعت کی ہیں (اُسی معلوم ہے) کہ اللہ تعالیٰ نے قوۃ مفکرہ کو عقل انسانی کے واسطے ایک خادم بنایا ہی۔ (لیکن اس پر بھی) عقل خود اُس کی (خادم بنکر) پیچھے ہو لیتی ہے باوجودیکہ وہ یہ بھی جانتی ہی کہ وہ قوۃ مفکرہ جو کچھ اُس کو عطا کرتی ہی وہ اُس میں اپنے حدود

مرتبہ سے ذرا بھی تجاوز نہیں کر سکتے اور وہ اس سے عاجز ہے کہ کسی دوسری قوۃ کی سرحد سرحد میں قدم رکھ سکے۔ مثلاً قوۃ حافظہ یا مصورہ کا کام اُس سے نکل سکے یا قوت متخیلہ کے قائم مقام بن سکے یا حواس خمسہ (لمس۔ طعم۔ شم۔ سمع۔ بصر) میں سے وہ کسی ایک کے فرائض کو انجام دے سکے۔

یہ سب کچھ ہے اور قوت مفکرہ کی حدود واختیارات کی یہ تنگی بھی سب کو معلوم ہے۔ مگر اس پر بھی یہ کس قدر حیرت انگیز بات ہے کہ عقل انسانی اپنے پروردگار کی معرفت کے بارہ میں اُسی فکر ناقص کی تقلید پر اڑی ہوئی ہے اور اُس کا پروردگار خود جو کچھ اپنی کتاب میں اور اپنے رسول کی زبانی اپنی نسبت بیان فرماتا ہے اُس کی تقلید سے برابر کتراتی ہے۔

عالم میں جو غلطیاں مختلف طرح کی پھیلی ہوئی ہیں عقل کی یہ غلطی اُن سب میں عجیب تر ہے اور تماشہ ہے کہ سوائے اُن معدود لوگوں کے جن کی بصیرت کی آنکھیں خدا تعالیٰ نے روشن کردی ہیں۔ ہر صاحب فکر اسی عام غلط کاری میں مبتلا ہے۔ ہاں ارباب بصیرت خوب جانتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ نے ہر چیز کی ایک خاص فطرت بنائی (اور اُسی خاص فطرۃ کے اعتبار سے اُس شی کی عمل وحرکت کی حدبندی کردی ہے) مثلاً قوت سامعہ (یا کانوں) کی فطرت مسموعات (آوازوں) کے ادراک سے تجاوز نہیں کر سکتی۔ اور عقل انسانی فقط اسی حلقہ میں اُس کے محتاج اور آوازوں کی شناخت۔ حروف کے قطع وبرید۔ الفاظ کے تغیرات۔ اور لغات کی تقسیم میں اُس سے امداد کے طالب ہے۔ چنانچہ عقل انسانی قوۃ سامعہ ہی کے ذریعہ سے پرندوں کے چہچہے۔ ہواؤں کی سائیں سائیں۔ کواڑوں کی چوں چوں۔ پانی کی خرخر۔ انسان کی چیخ پکار اور دوسرے جانوروں کی بولیوں میں تفریق کرتی ہے۔ ورنہ عقل انسانی میں بجائے خود یہ قدرت کہاں کہ بغیر توسط سمع کے ان چیزوں کے باہمی امتیازات کو

قایم رکھ سکے۔

اسی طرح قوۃ باصرہ (آنکھوں) کو خیال کرو کہ اُس کا دائرہ عمل محض مبصرات (دکھائی دینے کے قابل چیزوں) تک محدود ہی یعنی عقل کو اسکی امداد کے بغیر سبزی کو زردی سے اور زردی کو سفیدی سے اور سفیدی کو سیاہی سے اور اسی طرح ہر ایک رنگ کو دوسرے رنگ سے جُدا کرنا عادۃً ممکن نہیں ہی۔ اور یہی حال اِن دونوں کے ماسوا دوسری اُن تمام قوتوں کا ہی جو حواس کے نام سے مشہور ہیں۔ اور نیز قوت خیالیہ کا جسکو اپنی کارگذاری میں حواس خمسہ کی احتیاج ہے۔ کیونکہ تخیل فقط اُن چیزوں کے ساتھ ہی متعلق ہو سکتا ہی جو حواس کے ذریعہ سے حاصل ہوتی ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس قوۃ حافظہ اگر خیال کی حاصل کی ہوئی اشیا کو روکے نہ رکھے۔ تو خیال کے خزانہ میں کچھ بھی باقی نہ رہے۔ اس حیثیت سے جیسا کہ وہ حواس خمسہ کا محتاج ہے ایسے ہی قوۃ حافظہ سے بھی بے نیاز نہیں۔ پھر قوت حافظہ کو بہت سے ایسے موانع پیش آتے ہیں جو اُس کے اور خیال کے درمیان حائل ہو کر قوت حافظہ کے ضعف اور اُس سے امور کثیرہ کے فوت ہونے کا باعث بن جاتے ہیں۔ اس لئے ایک قوۃ مذکرہ کی حاجت ہوئی جو قوۃ حافظہ کی مددگار بنکر اُس کو وہ باتیں یاد دلا دیا کرے جن سے ذہول ہو گیا ہو۔

اِن سب کے بعد قوۃ مفکرہ خیال کی طرف متوجہ ہوتی ہی تاکہ قوۃ مصورہ کے توسط سے خیال کے حاصل کردہ امور کو اِس طور پر ترکیب دے کہ اُس سے کسی دعوی کے متعلق ایسی دلیل پیدا ہو جاوے جس کی انتہا اُن محسوسات اور بدیہات پر ہوتی ہو جو آدمی کی جبلۃ میں مرکوز ہیں۔ اِس طرح سے جب فکر دلیل کو ایک اچھی معقول صورت پر قائم کر دیتا ہی تو اب عقل انسانی اُس بنی بنائی چیز کو لیکر دعوی پر منطبق کر دیتی ہی۔

لیکن وہاں سے یہانتک پہنچنے میں جتنی قوتوں کو کچھ بھی دخل رہا اُن میں سے کوئی

ایسے نہیں جس کے کام میں بہت سے موانع اور بہت قسم کی غلطیوں کا مساغ نہو اور جس کے لئے کسی ایسے معیار کی ضرورت نہ پڑے جو صحیح کو فاسد سے اور مغز کو پوست سے جدا کر سکے۔

پس تم غور کرو کہ عقل فی حد ذاتہ کس قدر جاہل کیسی بے بس اور دوسری قوتوں کی کتنی حاجتمند ہی اور ان قوتوں میں سے ہر ایک کو جو اغلاط پیش آتے ہیں اور جہانتک کہ اُس کے دائرہ عمل کی تحدید کی گئی وہ بھی سب پر روشن ہوچکی۔ لیکن اس پر جب اُس کو کوئی بات اس مخدوش اور پُرخطر طریق سے بہت سی ٹھوکریں کھاکر حاصل ہوتی ہی اور اُسکے مقابلہ میں دوسری جانب خود خداوند رب العزّۃ کوئی خبر دیتا ہے تو یہ کہکر وہ خدا کی بتلائی ہوئی بات کو ٹالدیتی ہی کہ میرا غور وفکر اس کو رد کرچکا ہی۔

اللہُ اکبر۔ یہ عقل خداتعالیٰ کے مرتبہ سے کس قدر جاہل ہی کہ اُس نے اپنے فکر ناقص کی تقلید میں خداتعالیٰ پر جرح کرنے کو آسان سمجھا۔ حالانکہ تم پہلے سمجھ چکے ہو کہ عقل کے پاس بجائے خود کسی طرح کا اور کسی شی کا بھی علم موجود نہیں۔ اُس کا کام محض حواس خمسہ قوۃ خیالیہ قوۃ مصورہ۔ اور علیٰ ہذا القیاس دوسری قوتوں کی عطا کئے ہوئے علوم کو قبول کرنا ہی۔ تو ایسی حالت میں اُس کے لئے نہایت ہی مناسب تھا کہ وہ بجائے قوت فکریہ وغیرہ اپنے خدام کے سامنے دست سوال دراز کرنے اور اُن کے عطایا کو قبول کرنے کے اپنے آقا و رب العزّۃ کے روبرو ہاتھ پھیلاتے اور اُسی کی بخششوں کو لیکر سر اور آنکھوں پر رکھتے۔

اور جبکہ اُسے معلوم ہی کہ اُس کا فکر خیال کا مقلد ہے اور خیال حواس خمسہ کا اور اُس کے ساتھ ہی اُس کو اپنی امداد کے لئے قوۃ حافظہ اور مذکرہ کی بھی حاجت ہی اور یہ بھی علم ہی کہ یہ تمام قوی اپنی اپنی سرحد فطرۃ اور دائرہ عمل سے باہر ایک قدم نہیں رکھ سکتے (مثلاً

خوبصورت بدصورت کے ادراک میں کانوں سے کام نہیں چل سکتا۔ اور آوازوں کے بُرے بھلے کو آنکھیں نہیں سمجھ سکتی۔ خوشبو اور بدبو کا امتیاز زبان کے حدود عمل سے خارج ہے اور تلخ وشیریں کی تفریق سے ناک کو کوئی سروکار نہیں اور علیٰ ہٰذالقیاس خود عقل کو اپنی ذات کے اعتبار سے اُن چند ضروریات کے سوا جن کا علم فطرۃً ہوتا ہے اور کوئی چیز معلوم نہیں) تو بھلا تمام قوتوں کے اِس طرح کی تنگ میدانی اور بیچارہ گی کے باوجود بھی کیا وجہ ہی کہ ہماری عقل اُس شخص کے قول کو قبول نہیں کرتی جو انسان میں قوۃ مفکر کے سوا ایک اور ایسی قوت کا قائل ہی جس کے احکام قوۃ مفکرہ کے احکام سے بالاتر ہوں اور جس کو اُن طریقوں کے استعمال کرنے سے جو اس فن کے تجربہ کاروں نے لکھے ہیں بموہبت الٰہی اہل اللہ (ملائکہ انبیا اور اولیاء کاملین اپنے اندر پاتے ہیں اور کل کتب سماویہ جس کے وجود کی خبر دیتے ہیں باآواز دہل ناطق ہیں۔

اِس لئے تمکو چاہیئے کہ اخبار الٰہیہ کے ماننے میں اپنی عقول (ناقصہ سقیمہ) کی کچھ پرواہ نہ کرو اور مخلوق کے مقابلہ میں خالق کی تقلید کو بہتر سمجھو کیونکہ کثیر التعداد انبیاء و اولیا نے اِنہیں چیزوں کو قبول کیا اور اُنہیں پر وہ ایمان لائے۔ اور اُنہیں کی تصدیق کی۔ اور ہمیشہ وہ اسی کو پسند کرتے رہے کہ اپنے رب کی معرفت میں خود اسی کی تقلید کرنا اپنے اوہام و افکار کی تقلید سے اولیٰ و انفع ہی۔ پھر او عقلمند بنکر اخبار الٰہیہ سے انکار کرنے والے تجکو کیا ہوا کہ خدا کے بارے میں تو خود خدا کی اور اُس کے برگزیدہ بندوں کی نہیں سُنتا اور اپنے خیالات کے پیچھے پڑا پریشان ہو رہا ہے۔

دیکھو جب یاایہا الذین آمنوا اٰمِنوا کے سُننے والوں کو یہ معلوم ہوا کہ علاوہ اُس ایمان کے جو دلائل و افکار سے ہمکو حاصل ہوچکا کوئی دوسرا ایمان بھی مطلوب ہے تو

اُنہوں نے معًا ریاضت خلوۃ اور مجاہدہ کا طریق اختیار کیا اور خدا کو فراموش کرانے والے تعلقات کو یک لخت منقطع کر کے دنیا میں رہکر ہی وہ دنیا سے الگ ہو بیٹھے۔ اور دل کو سب جھگڑوں سے خالی اور قلب کو شوائب افکار سے پاک کر کے خالص خدا کی طرف متوجہ ہوئے۔ کیونکہ انبیا و مرسلین سے یہ ہی راستہ اُن کو معلوم ہوا تھا اور اُنہوں نے سُن رکھا تھا کہ بندہ جب سارے دل سے خدا کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو حق تعالیٰ بھی اُس پر اپنی مہربانی اور رحمت کا سایہ ڈالتا ہے اور اپنے دامن عطوفت میں لے لیتا ہی اس سے اُنہوں نے سمجھ لیا کہ خدا کی طرف جانے والوں کے لئے فکر کے راستے سے یہ یہ راستہ زیادہ نزدیک ہے کیونکہ خود خداوند رب العزۃ نے اپنے رسول کی زبان سے یہ منادی کرادی کہ جو کوئی ہماری طرف لپک کر آتا ہی ہم اُس کی طرف دوڑ کر جاتے ہیں اور یہ کہ نہ آسمان میں۔ نہ زمین میں۔ بلکہ فقط قلب مومن میں یہ وسعت ہی کہ وہ ہماری عظمت وجلال کا تحمل کر سکے۔

اِس بنا پر یہ لوگ اپنے سارے دل سے خدا کی بارگاہ میں متوجہ ہوئے اور تمام قویٰ وافکار کے دھندوں کو چھوڑ دیا۔ اُس وقت خدا تعالیٰ نے اپنے نور میں سے علم صادق کی ایک روشنی اُن کے دلوں پر ڈالدے۔ اور اُن کو خالص اپنا ہی والہ و شیدا بنا لیا۔ پھر کیا تھا۔ نظر و فکر کی وہ ساری کمزوریاں کافور ہوگئیں۔ اور خالق اکبر کے ارشادات و قوانین کے سامنے اُنہوں نے اپنی عقلوں کے تیار کئے ہوئے قانون کو بھلا دیا۔ آہ

تم خود سوچو اور انصاف کرو کہ اگر ہر کس و ناکس اپنی عقل شخصی کے بنائے ہوئے قانون پر چلنے کا مجاز کر دیا جاوے جیسا کہ آزاد خیالی کے مدعی آج کل چاہتے ہیں تو دنیا میں کیا کچھ خربطہ ہو اور ہزاروں لاکھوں خود تراشیدہ قوانین کی کشمکش میں (جو ہر گروہ اپنے پیمانۂ فکر

اور اندازۂ فہم کے موافق تیار کرسکتا ہو۔ لوگوں کی زندگی کیا کچھ دشوار ہو جائے۔

بہت سے لوگ یہ کہتے ہیں کہ جب عقل و نقل میں مزاحمت واقع ہوا کرے اس وقت ہمکو یہ اختیار ملنا چاہیئے کہ ہم عقل کے احکام کو نقل صحیح کی تسلیم سے مقدم سمجھیں کیونکہ نقل کے ماننے کا اصل ذریعہ یہی عقل ہی ہو۔ تو خدانخواستہ عقل کو بے اعتبار ٹھہرانے کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم عقل و نقل دونوں کی طرف سے بدگمان ہو گئے ہیں۔

لیکن اس شبہ کا جواب آپ کو ہماری تقریر سابق سے بوجہ احسن معلوم ہو چکا ہو کیونکہ ہم مدلل طور پر بتلا چکے ہیں کہ عقل سلیم و نقل صحیح میں تعارض ہو ہی نہیں سکتا ہاں اگر عقل کی سلامتی یا نقل کی صحت مخدوش ہو جاوے تو بیشک ایسا ہونا ممکن ہی مگر اسوقت ہمارا پہلا فرض یہ ہوگا کہ یا تو اپنی عقل کو مرض سے چھڑانے اور سلامتی پر لانے کی کوشش کریں اور یا نقل کے ثبوت کے واسطے کوئی قابل وثوق ذریعہ بہم پہنچائیں ودونہ خرط القتاد۔

اس جواب کی پوری تفصیل شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ نے اپنی بیش بہا اور ضخیم کتاب[ع] بیان موافقۃ صریح المعقول لصحیح المنقول میں لکھی ہو جس کے جستہ جستہ اقتباسات بھی ہم باوجود قصد کے تطویل کے خیال سے قلم انداز کر کے آخر میں یہ گذارش کرتے ہیں کہ۔

جو کچھ ہمنے اس مضمون میں یہانتک بیان کیا ہو اُس کا یہ منشا ہرگز نہیں کہ فکر و استدلال ایک محض عبث اور لغو چیز ہے یا اُس سے تعرض کرنا کوئی شرعی گناہ ہو۔ لیکن ہاں کسی فرد بشر کے واسطے ہم یہ جائز نہیں رکھتے کہ وہ اپنی عقل شخصی اور فکر ناقص کو

[ع] یہ کتاب اہل مصر نے منہاج السنۃ کے حاشیہ پر طبع کی ہو۔

اصل اصول ٹھہراکر انبیا علیہم السلام کے پاک وصاف صحیح وصادق اور بلند وبرتر تعلیمات کو زبردستی اُن پر منطبق کرنے کی کوشش کرے جس پر اکثر اوقات اُسکا ضمیر بھی خود اندر سے نفریں کر رہا ہو۔ اس کے برخلاف نہایت ضروری ہی کہ انسان خدا اور اُس کے رسولوں کے ارشادات کو اصل قرار دیکر اپنی عقلی معلومات کو اُن کے تابع بناوے اور جو کچھ وہ فرمائیں اُس کو اپنے امراض روحانی کے حق میں اکسیر شفا تصور کر کے سمعًا وطاعتہً کہتا ہوا بلا حجت و تکرار سر اور آنکھوں پر رکھے۔

والذین یحاجون فی اللہ من بعد ما استجیب لہ حجتہم داحضۃ عند ربہم وعلیہم غضبٌ ولھم عذابٌ شدید۔	اور جو لوگ اللہ کے بارہ میں نبی سے جھگڑا کرتے ہیں جبکہ آدمی اُس کی بات قبول کر چکے تو اُن کی حجت باطل ہی اور اُن پر خدا تعالی کا غضب ہے اور اِن کیلئے سخت عذاب ہے۔

تنبیہ۔ جو کچھ ہمنے اس رسالہ میں اپنے نزدیک اختصار جامع اور متانت ومعقولیت کے ساتھ لکھا ہی اُس کا زیادہ تر زور (جیسا کہ ناظرین محسوس فرمائیں گے) عقل کی صحت وسلامتی پر رہا ہی۔ لیکن نقل کی صحت وضعف کے قواعد وشرائط وغیرہ سے یہاں مطلقًا بحث نہیں کی گئی جس کے واسطے اوّل تو علم اصول حدیث کی کتابوں کا مطالعہ انشاء اللہ تعالی کافی ہوگا اور اگر وقت نے مساعدت اور قادر مطلق نے امداد فرمائی تو ہم ایک مستقل رسالہ اس موضوع کے متعلق بھی لکھکر اہل ملک کے روبرو پیش کرینگے جس میں مولانا عبد اللہ العمادی کے رسالہ علم الحدیث پر بھی مبسوط تبصرہ کیا جاویگا۔ وما ذالک علی اللہ بعزیز وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔

الراقم
شبیر احمد عثمانی۔ عفا اللہ عنہ
دار العلوم۔ دیوبند

۲۲، ربیع الثانی
سنہ ۱۳۳۳ھ

کتبخانه و[illegible]